رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۳۰

جلد ۲۸ عدد ۶

ذوالحجہ ۱۳۵۶ھ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ ۔ لاہور پاکستان

چندہ سالانہ چھ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

خالی صفحه

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۴۸	ذی الحجہ ۱۳۷۶ھ مطابق ستمبر ۱۹۵۷ء	عدد ۶

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

گذشتہ ترجمان القرآن میں ہم نے قوموں کی تعمیر و ترقی میں ماضی کی اہمیت پر بحث کرتے ہوئے بتایا تھا کہ مسلم قوم کے لیے اتباعِ اسلاف کی اہمیت دنیا کی دوسری اقوام سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کے ہاں رنگ و نسل، زبان و وطنیت کے وسیع اختلاف کے باوجود جو وحدتِ فکر اور جو وحدتِ عمل نظر آتی ہے، اُس میں علاوہ دوسرے وجوہ کے، ایک اہم وجہ اس ملت کی سلف سے وابستگی بھی ہے۔ سلف کے ساتھ تعلق نے نہ صرف اسے ایک سلک میں منسلک رکھا ہے بلکہ اسے ایک واضح نظامِ سیاست، نظامِ معیشت اور نظامِ معاشرت بھی عطا کیا ہے۔ اسی سے اس کے اجتماعی شعور کا ہیولیٰ تیار کیا گیا ہے اور یہ ایک ایسی عظیم نعمت ہے، جس سے دنیا کی دوسری قومیں قریب قریب محروم ہیں۔ یہ اس اجتماعی شعور کا اعجاز ہی ہے کہ یہ قوم ہزار اخلاقی بیماریوں میں مبتلا ہونے کے باوجود "حق" کے نقطۂ نظر سے بالکل صحت مند ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ صدیوں کے انحطاط کے بعد آج بھی جب اُس کے سامنے اسلام کی کوئی ایسی تعبیر یا حیاتِ اجتماعی کی ایک ایسی شکل پیش کی جائے جس کی تائید سنتِ رسول اور آثارِ صحابہ سے نہ ہوتی ہو، اور جس کے حق میں شروع سے اب تک کے جمہور امت کا مسلم التبوت نظامِ فکر نہ ہو، تو یہ قوم اس تعبیر اور حیاتِ اجتماعی کے اس نقشہ کی ظاہری چمک کے باوجود اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس ملت کا ہر فرد دلائل سے یہ ثابت نہ کر سکے کہ اس میں فلاں فلاں جگہ اسقام ہیں مگر اس کا احساس خود اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ "ایں نقش دیگر است"۔

ملت کے اس طرزِ فکر کو ہمارے بعض "کرم فرما" جذباتیت، رجعت پسندی یا آباء پرستی کہہ کر اس کے خلاف ایک رائے عام تیار کرنے کی منظم کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن ہم یہ عرض کریں گے کہ جس انداز سے

اس روش کے خلاف نفرت پھیلائی جا رہی ہے اُس کے پیچھے بھی ان کی مخصوص مصلحتیں کام کر رہی ہیں۔ یہاں یہ موقع نہیں کہ ہم ان حضرات کی اس جدوجہد کے نتائج پر کوئی تفصیلی بحث کریں۔ اس پر انشاء اللہ کسی آئندہ موقع پر گفتگو کی جائے گی۔ مگر یہاں اتنی گذارش کر دینا ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ یورپی اخلاق اور معاشرت کو جس ذہنیت نے سب سے زیادہ تباہ کیا ہے وہ یہی "مصلحت کوشی" اور "فکری بے راہ روی" ہی تو ہے جسے نہایت عیاری سے "عقلیت پرستی" اور "جدت" کا نام دے دیا گیا ہے۔

ایک مسلمان کو انبیاء علیہم السلام اور خصوصاً سید الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے جلیل القدر اصحاب سے جو قلبی تعلق ہے، اس میں کافی دخل جذبات کا بھی ہے اور ہونا چاہیے۔ جو لوگ اس نسبت اور رشتہ کو توڑنے یا کمزور کرنے کے آرزو مند ہیں، اُن کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ "جذبات" کے خلاف ایک معاندانہ فضا ہموار کریں۔ یہ حضرات بڑی چالاکی کے ساتھ لوگوں کے ذہنوں میں اس خیال کو راسخ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہر فعل جس میں جذبات کسی جہت سے بھی دخیل ہوں، سراسر احمقانہ ہے۔ یہ اندازِ فکر بالکل غلط اور انسانی فطرت کے عین منافی ہے۔ جذبات، حیاتِ انسانی کا جزو لاینفک ہیں۔ ان کی اگر صحیح طریقے سے پرورش کی جائے تو اس سے نہایت ہی اچھے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ انسانی شخصیت کی تکمیل انہی کے ذریعے ہوتی ہے۔ انہی کی مدد سے ایک فرد کی صلاحیتیں ایک مرکز پہ مجتمع ہوتی ہیں۔ اسے ایک نصب العین سے عشق اور محبت پیدا ہوتی ہے اور اُس کے اندر وہ "جرأتِ رندانہ" جنم لیتی ہے جس سے وہ "آتشِ نمرود" میں بے خطر کود پڑتا ہے۔ عقل ایک میزان ہے، یہ ایک کسوٹی ہے جس کی مدد سے ہم کھرے کو کھوٹے سے، خوب کو ناخوب سے، حق کو باطل سے ممیز کرتے ہیں۔ لیکن وہ چیز جو صحیح اور حق کے حصول کے لیے ہمارے اندر سعی وجہد کا ولولہ پیدا کرتی ہے وہ جذبات ہی ہیں۔ اگر انسان کے اندر جذبات نہ ہوتے تو وہ صرف ایک "پیمانہ" ہوتا مگر وہ ایک صاحبِ احساس انسان نہ ہوتا۔ چنانچہ اسی جذبہ کو ہمارے ایمان کا مدار قرار دیا گیا ہے:

عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ — حضرت انسؓ سے روایت ہے، انھوں نے کہا کہ رسول اللہ

علیہ وسلم لا یؤمن احدکم حتی اکون احبّ الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین (مشکوٰۃ ۔ کتاب الایمان)

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے کوئی صاحب ایمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اُس کے نزدیک اس کے والد اُس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

اس ضمن میں یہ بھی ذہن نشین رہے کہ عمل کے جو چشمے تحت الشعور سے اُبلتے ہیں، وہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ کڑوے ہی ہوں۔ اگر جذبات کے "سیلِ بے پناہ" پر فکر صحیح کے بند باندھ دیئے جائیں تو اس سے نہ صرف شعور کی اوپر کی سطح پر، بلکہ اُس کے نیچے بھی پاکیزہ احساسات کے ایسے متعدد دھارے بہ نکلتے ہیں جن سے شخصیت کی کھیتی سیراب ہو کر سیرت و کردار کی نہایت عمدہ فصلیں اُگاتی ہے۔ اس لیے ہر وہ چیز جو تحت الشعور کے چلمن میں سے چھن چھن کر آئے، یا جو جذبات کی سطح پر تیرتی ہوئی ہم تک پہنچے وہ ہمیشہ ہی نقصان دہ اور مضرت رساں نہیں ہوتی۔ جو انسان اپنے قلب کو سلبی خیالات کی بازی گاہ نہیں بناتا، جو وساوس اور حرص و ہوا سے ہمیشہ اسے پاک رکھتا ہے، اور ان کی بجائے ایجابی، حیات بخش اور نیک خیالات کی پرورش کرتا ہے اُس کا دل بھلائی کا مرکز ہوتا ہے، شرافت کا مبدا ہوتا ہے، اور اس سے ہمیشہ نیکی کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ اس کے جذبات کو گمراہ جذبات اور نقصان دہ جذبات کے قبیل میں شمار کرنا کسی معقول آدمی کا کام نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح بعض حضرات مسلمانوں کی اسلاف سے محبت کو آباد پرستی یا رجعت پسندی سے تعبیر کرتے ہوئے فوراً یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ اس رجحان کی قرآن حکیم نے سختی سے مذمت کی ہے اور اپنے اس دعوے کی تائید میں وہ چند آیتیں بھی لے آتے ہیں جن میں باپ دادا کی کورانہ تقلید کو گمراہی کہا گیا ہے۔ لیکن یہ حضرات یہ نہیں دیکھتے کہ جس چیز کو قرآن پاک غلط کہہ رہا ہے وہ یہ نہیں کہ ہر وہ عمل جو باپ دادا نے کیا ہے وہ یقیناً گمراہی تھا اور اب جو شخص بھی اس کی پیروی کرے گا وہ بالضرور گمراہ ہی ہوگا۔ بلکہ اس نے جس رجحان کی مذمت کی ہے وہ یہ ہے کہ ایک شخص کے پاس اپنے کسی فعل کے برحق ہونے کے لیے اور

کوئی وجہ جواز بجز اس کے نہ ہو کہ "باپ دادا کے وقتوں سے یہی کچھ ہوتا آرہا ہے" ظاہر بات ہے کہ یہ طرز عمل ان حالات میں تو ضرور غلط ہے جن میں باپ دادا گمراہی میں مبتلا ہوں اور ایک شخص انہی کی اندھا دھند پیروی کرتا چلا جائے۔ ایسا شخص لازمی طور پر غلط راستے پر پڑ جائے گا۔ لیکن یہ دیکھیے کہ قرآن حکیم کن حالات میں آباؤ اجداد کی پیروی پر تنبیہ کر رہا ہے۔

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا ۔ اَوَلَوْ کَانَ اٰبَآؤُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَھْتَدُوْنَ ۔ (البقرہ - ۲۱)

اور جب کبھی ان سے کہا گیا کہ جو علم خدا نے بھیجا ہے اس کی پیروی کرو تو انھوں نے یہی کہا کہ ہم تو اس بات کی پیروی کریں گے جو ہمیں باپ دادا سے ملی ہے۔ اگر ان کے باپ دادا کسی بات کو نہ سمجھتے ہوں اور راہ راست پر نہ ہوں تو کیا یہ پھر بھی انہی کی پیروی کیے چلے جائیں گے۔

ان آیات میں دیکھیے، جس چیز کو غلط قرار دیا گیا ہے وہ محض اتباع اسلاف نہیں بلکہ یہ ہے کہ انسان ان کی پیروی پر اس حالت میں بھی اصرار کرے جب کہ اسلاف نہ تو عقل رکھتے ہوں اور نہ ہی ہدایت یافتہ ہوں۔ قرآن چاہتا ہے کہ ان کی پیروی اختیار کرنے سے پہلے آدمی آنکھیں کھول کر دیکھ لے کہ وہ معقول اور صحیح راستے پر بھی چل رہے تھے یا نہیں۔

اسی طرح دوسری جگہ فرمایا:

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ تَعَالَوْا اِلٰی مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَاِلَی الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ کَانَ اٰبَآؤُھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَھْتَدُوْنَ (المائدہ - ۱۴)

اور جب اُن سے کہا گیا کہ آؤ اس فرمان کی طرف جو خدا نے بھیجا ہے اور آؤ رسول کے طریقہ کی طرف، تو انھوں نے کہا کہ ہمارے لیے تو بس وہی طریقہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ باپ دادا کی پیروی کیے چلے جائیں گے چاہے اُن کو کسی بات کا علم نہ ہو اور وہ سیدھے راستے پر نہ ہوں۔

یہاں بھی صرف ایسے آباؤ اجداد کی پیروی پر گرفت کی گئی ہے جو نہ تو علم رکھتے ہوں اور نہ راہ راست

ہی پر ہوں۔

إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا هَٰذِهِ
التَّمَاثِيلُ الَّتِي أَنتُمْ لَهَا عَاكِفُونَ ۔ قَالُوا
وَجَدْنَا آبَاءَنَا لَهَا عَابِدِينَ ۔ قَالَ لَقَدْ
كُنتُمْ أَنتُمْ وَآبَاؤُكُمْ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۔
(الانبیاء - ۵)

جب آپ نے اپنے باپ اور قوم کو کہا کہ کیسی مورتیاں
ہیں جن پر آپ لوگ مجاور بنے بیٹھے ہیں تو وہ کہنے لگے
ہم نے اپنے باپ دادا کو انہی کی پوجا کرتے ہوئے پایا۔
آپ نے کہا کہ تم اور تمہارے باپ دادا صریح گمراہی
میں رہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ
قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَ
لَوْ كَانَ الشَّيْطَانُ يَدْعُوهُمْ إِلَىٰ عَذَابِ
السَّعِيرِ ۔ (لقمان - ۳)

جب ان سے کہا گیا کہ اس حکم کی پیروی کرو جو خدا نے
بھیجا ہے تو انھوں نے کہا کہ نہیں ہم تو اس بات کی
پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟
کیا وہ اپنے باپ دادا ہی کی پیروی کریں گے خواہ شیطان ان کو
عذاب جہنم ہی کی طرف کیوں نہ بلا رہا ہو۔

مندرجۂ بالا آیات اس حقیقت کی ترجمان ہیں کہ قرآن حکیم جس چیز کو گمراہی سے تعبیر کر رہا ہے وہ اسلاف
کی پیروی نہیں بلکہ وہ غلط اندازِ فکر ہے جو ایک شخص اپنے دل پسند رواج، عقائد، خیالات و نظریات کو نہ
چھوڑنے کے لیے بسا اوقات اختیار کر لیتا ہے۔ وہ اپنی اس غلط روش کو صحیح ثابت کرنے کے لیے آباؤاجداد
کا سہارا لیتا ہے۔ تفکر کا یہ انداز یا استدلال کا یہ طریق یقیناً قابلِ ملامت ہے اور قرآن پاک نے بڑی سختی سے
اس پر تنبیہ فرمائی ہے۔ مگر یہ اسی صورت میں ہے جب کہ آباؤاجداد بے عقل ہوں، بے علم ہوں، ضلالت
میں مبتلا ہوں، اور شیطان کی پیروی کرنے والے ہوں۔ لیکن یہ صریح ظلم و زیادتی ہوگی اگر ان آیات کا مصداق
اُن نفوسِ قدسیہ کو قرار دیا جائے جن کی نیکی و راست روی کی نہ صرف خداوند تعالیٰ خود شہادت دیتے ہیں بلکہ
اُن کی پاکیزہ روش کو ہمارے لیے ایک نمونہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور ہمارے ایمان کی بنیاد ہی اس بات
پر رکھی جاتی ہے کہ ہم اُن کی پیروی کریں۔

وہ لوگ جنہوں نے انسان کی عمرانی زندگی کا ایک سرسری سا جائزہ بھی لیا ہے وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ انسان کے کسی قول یا فعل پر "نئے پن" کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ یہاں ہمیشہ ماضی ہی استقبال کا بھیس بدل کر حال کے سٹیج پر جلوہ افروز ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اس دنیا میں انسانی اعمال کی کوئی شاہراہ ایسی نہیں جس پر انسانیت کے قافلے نہ گزرے ہوں۔ انسانیت کے یہ قافلے بظاہر تو بے شمار دکھائی دیتے ہیں مگر اصل میں یہ صرف دو ہی ہیں ۔۔ شر کا قافلہ اور خیر کا قافلہ ۔۔ ان دونوں قافلوں میں ایک بنیادی اور اساسی فرق یہ ہے کہ شر کا قافلہ کبھی ایک راہ پر نہیں چلا۔ اُسے چونکہ مختلف ادوار میں مختلف قسم کی گمراہیاں جادۂ مستقیم سے ہٹاتی رہیں، اس لیے وہ بھی شر و فساد کی مختلف وادیوں میں بھٹکتا رہا۔ اس میں جو شخص بھی شریک تھا اُس نے اپنے لیے یہ ضروری نہ سمجھا کہ اپنے پیشروؤں کے قدم بقدم چلے، بلکہ اُس کے نزدیک معیارِ کمال یہی تھا کہ وہ جہاں تک ممکن ہو جدت سے کام لے۔ اس کے برعکس خیر کے قافلہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ رہی ہے کہ اُس کے افراد کی راہ ہمیشہ ایک اور روش یکساں رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ازل سے اس قافلہ کا نقطۂ آغاز ایک، منزلِ مقصود ایک اور سرچشمۂ ہدایت و رہنمائی بھی ایک ہی رہا ہے۔ اس میں شامل ہونے والوں کے لیے کوئی دوسری صورت بجز اس کے ممکن نہیں کہ وہ اپنے پیشروؤں کے نقشِ پا کو ہی مشعلِ راہ بناتے رہیں۔ اسی طرزِ عمل سے اُن میں اشتراکِ عمل کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اسی بنیاد پر وہ نہ صرف اپنی قوم، ملک، نسل اور اپنے ہم عصروں میں سے اپنے ساتھی تلاش کرتے ہیں بلکہ وہ پوری انسانی تاریخ میں اُن نیک اور ہدایت یافتہ افراد کی جستجو بھی کرتے ہیں جو اس راستے پر گامزن ہوئے۔ اس طرح ان میں اس رہ گزر کا ایک صحیح احساس یا وجدان پیدا ہوتا ہے جو انہیں ہر قدم پر بتاتا رہتا ہے کہ اب تم ٹھیک راستے پر جا رہے ہو۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہاں "جدت" (اسلامی اصطلاح میں "بدعت" اور "احداث فی الدین") سب سے بڑی گمراہی ہے اور سلف کی پیروی ہی ہمارے راہِ راست پر ہونے کی سب سے بڑی قوی دلیل ہے۔

آئیے اب یہ دیکھیں کہ اسلام ہمارے اندر اس احساس کو کس طرح ابھارتا ہے۔

قرآن مجید نے سب سے پہلے انسانی اذہان وقلوب میں اس خیال کی تخم ریزی کی ہے کہ خداوند تعالیٰ نے سب انبیاء کو ایک ہی دین دے کر دنیا میں مبعوث فرمایا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا (شوریٰ-۲)

اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا حکم کیا تھا نوح کو اور جس کا حکم بھیجا ہم نے تیری طرف اور جس کا حکم کیا ہم نے ابراہیم کو اور موسیٰ و عیسیٰ کو، یہ کہ قائم رکھو دین کو اور اختلاف نہ ڈالو۔

اس وحدتِ فکر نے نہ صرف ایک ہی دور کے بسنے والے انسانوں میں مغائرت کے پردوں کو چاک کر کے انہیں ایک برادری سے وابستہ کیا ہے بلکہ اسلام نے یہ نقطۂ نظر پیش کر کے کہ سب انبیا علیہم السلام ایک ہی دعوت اور ایک ہی دین کے علمبردار تھے، ایسی ملّت کی بنیاد رکھی ہے جو ازل سے ابد تک ایک ہی ہے۔ اسلام کا نقطۂ نظر جس طرح دوسرے معاملات میں نہایت وسیع ہے اسی طرح فلسفۂ تاریخ کے باب میں بھی اُس کے اندر بے حد وسعت ہے۔ اُس نے رنگ و نسل، زبان و وطن، بلکہ زمان و مکان کی پابندیوں سے یکسر آزاد ہو کر پوری انسانیت کا احاطہ کیا ہے۔ وہ پوری انسانی تاریخ کو حق و باطل کی ایک عالمگیر اور دائمی آویزش کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ اہلِ حق خواہ وہ کسی ملک، قوم یا دور سے تعلق رکھتے ہوں، سب ایک ہیں۔ اور اسی وجہ سے ہر داعی الی الحق نے یہ نہیں کہا کہ میں تمہارے لیے کوئی نئی چیز لے کر آیا ہوں بلکہ ہمیشہ اسی بات پر زور دیا کہ جو تعلیم میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں وہ بالکل وہی ہے جو میرے پیشرو بیان کر چکے ہیں۔ اس میں کوئی جدت نہیں۔

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ۔

آپ فرما دیجیے میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں مجھے معلوم نہیں کہ میرے ساتھ کیا ہونا ہے اور تمہارے ساتھ کیا، میں تو بس اس حکم کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے، اور میں کچھ نہیں ہوں مگر ایک صاف صاف متنبہ کر دینے والا۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کی دعوت کوئی نئی نہیں تھی بلکہ ایک لمبے سلسلے کی آخری کڑی تھی۔

اسی طرح دوسرے بے شمار مقامات پر مختلف انبیاء علیہم السلام نے اپنے برحق ہونے کے لیے علاوہ دوسرے دلائل کے ایک دلیل یہ بھی پیش کی ہے کہ ہم سے جو پہلے انبیاء گزرے ہیں انھوں نے بھی یہی موقف اختیار کیا اور ہم سب ایک ہی برادری کے مختلف افراد ہیں۔

أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِي ۔ قَالُوا نَعْبُدُ إِلٰهَكَ وَإِلٰهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلٰهًا وَاحِدًا وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ (البقرہ - ۱۵)

کیا تم اُس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ اس دنیا سے رخصت ہو رہے تھے۔ انھوں نے مرتے وقت اپنے بیٹوں سے پوچھا: بچو! میرے بعد تم کس کی بندگی کروگے ان سب نے جواب دیا: ہم اس ایک خدا کی بندگی کریں گے، جسے آپ نے اور آپ کے بزرگ ابراہیمؑ، اسمٰعیل، اور اسحٰق نے خدا مانا ہے اور ہم اُس کے مسلم ہیں

قُولُوا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۔ (البقرہ - ۱۵)

(مسلمانو!) کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیمؑ اسمٰعیلؑ اسحاقؑ، اور اولادِ یعقوب کی طرف نازل ہوئی تھی اور جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے تمام پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھی۔ ہم اُن کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے۔

پھر دیکھیے، کس بلیغ انداز میں اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین کا تعلق اپنے جدِ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بیان فرما رہا ہے:

وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهِ ۚ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ

جہاد کرو اللہ کی راہ میں جس طرح کہ جہاد کرنے کا حق ہے اُس نے تم کو منتخب کیا اور اُس نے دین میں تم پر کوئی

حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ۬ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ۔ (الحج-۱۰)

تنگی نہیں رکھی۔ تمہارے باپ ابراہیم کی ملت، اسی نے تمہارا نام مسلمان رکھا پہلے بھی اور اس قرآن میں بھی، تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ۔

پھر دیکھیے حضرت یوسف علیہ السلام بالکل صاف الفاظ میں یہ کہہ رہے ہیں کہ میں نے ایمان سے عاری قوم کے طور طریقوں کو چھوڑ کر اپنے باپ دادا یعنی ابراہیم و اسحٰق و یعقوب علیہم السلام کے دین کو اختیار کیا ہے۔

وَاِنِّیْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ۔ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ (یوسف-۴)

اور واقعہ یہ ہے کہ میں نے اُن لوگوں کا طریقہ چھوڑ کر جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں، اپنے بزرگوں، ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہمارا یہ کام نہیں کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں۔

یہ سب آیات اس حقیقت کی شاہد ہیں کہ اتباعِ اسلاف اُس حالت میں بالکل ناگزیر ہے جب کہ اسلاف صراطِ مستقیم پر گامزن ہوں، بلکہ بعد میں آنے والوں کے لیے صداقت اور سچائی کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ وہ اسی راستہ پر ہیں جس پر اُن سے پہلے کے نیک اور راست رو لوگ تھے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے جو انبیاء علیہم السلام گزرے ہیں وہ اپنے پیروؤں کو صرف یہی ہدایت نہیں کرتے تھے کہ وہ ان سے پہلے گزرے ہوئے انبیاء کی پیشوائی تسلیم کریں، بلکہ یہ عہد بھی لیتے تھے کہ وہ ان کے بعد آنے والے انبیاء کی بھی پیروی کریں۔ لیکن سلسلۂ نبوت کے آخری تاجدارؐ کے تشریف لے آنے کے بعد جب نبوت کا سلسلہ بالکل بند ہو چکا ہے، تو اب ہمارے ایمان کی اولین اور آخری شرط یہی ہے کہ ہم حضورؐ کی ہی پیروی کریں۔ آپ کا اتباع ہی ہماری زندگی کا اصل نصب العین اور

معراج ہے۔ چنانچہ ایک مسلمان کو اپنے ایمان کے بقا کے لیے ہر لمحہ اور ہر ثانیہ ماضی کی طرف ہی پلٹ کر دیکھنا پڑتا ہے۔ ایک ایسا ماضی جس میں اُس کا آئیڈیل جگمگا رہا ہے، جس سے اُسے راہ ہدایت حاصل ہوتی ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا۔

تمہارے لیے رسولِ خدا میں ایک اچھا نمونہ ہے، اُس کے لیے جو امید رکھتا ہے اللہ کی اور یومِ آخرت کی اور جو اللہ کو بہت زیادہ یاد کرتا ہے۔

مَّن يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ

جس نے رسول کا حکم مانا، اُس نے اللہ تعالیٰ کا حکم مانا۔

وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا۔

اور جو کوئی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے کہنے پر چلا۔ اس نے بڑی مراد پائی۔

وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَن يُرْضُوهُ

اللہ اور اس کے رسول اس کے زیادہ حق دار ہیں کہ وہ ان کو راضی کریں۔

قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ (آل عمران - ۴۶)

فرما دیجیے اگر تم اللہ کو چاہتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا۔

اسی طرح حدیث میں بھی اس مضمون پر مختلف پہلوؤں سے زور دیا گیا ہے کہ نجات کی واحد صورت یہی ہے کہ ایک مومن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے راستہ پر چلتا رہے۔ جو کچھ حضور نے فرمایا ہے اُس کی اتباع کرے اور جس سے انہوں نے منع فرمایا ہے اس سے رُک جائے۔

عن ابی هريرة رضی الله عنه عن النبی صلی الله علیه وسلم قال دعونی ما ترکتکم۔ انما هلك من كان قبلكم كثرة سؤالهم واختلافهم علی انبیاءهم

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھ کو چھوڑ دو جب تک میں تم کو چھوڑے رہوں۔ بے شک اگلی امتوں کو کثرتِ سوال نے اور اپنے انبیاء پر اختلافات نے ہلاک کیا۔ جب تم کو

فاذا نهيتكم عن شيءٍ فاجتنبوه واذا امرتكم بامرٍ فاتوا منه ما استطعتم۔

(متفق علیہ)

کسی بات سے منع کروں تو اس سے باز رہو اور جس بات کا حکم دوں تو اس کو کرو جتنی کہ تم میں استطاعت ہو۔

عن ابی هريرة رضی الله عنه انّ رسول الله صلی الله عليه وسلم قال كل امتی يدخلون الجنة الا من ابی، قيل مَن ابی يا رسول الله، قال من اطاعنی دخل الجنة ومن عصانی فقد ابی

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت کے سب لوگ جنت میں جائیں گے مگر وہ جنت سے محروم رہیں گے جنہوں نے انکار کیا۔ عرض کیا گیا یارسول اللہ انکار کرنے والا کون ہے۔ آپ نے فرمایا جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا جس نے نافرمانی کی اس نے انکار کیا۔

اس کے ساتھ حضور سرور کائنات نے دین میں نئی نئی باتیں داخل کرنے سے بھی منع فرمایا ہے۔

عن عائشة رضی الله عنها قالت قال رسول الله صلی الله عليه وسلم مَن احدث فی امرنا هذا ما ليس منه فهو ردٌ وفی رواية لمسلم: من عَمِلَ عملا ليس عليه امرنا فهو ردٌ۔

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے ہمارے اس کام (یعنی دین) میں کوئی نئی بات پیدا کی جو اس میں نہیں ہے تو وہ رد ہے اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس پر ہمارا طریقہ نہیں ہے تو وہ رد ہے۔

وعن جابر رضی الله عنه قال كان رسول الله صلی الله عليه وسلم اذا خطب احمرّت عيناه وعلا صوته واشتدّ غضبه حتّی كانه منذر جيشٍ يقول صبحكم ومساكم ويقول: بُعِثتُ انا و

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب خطبہ فرما رہے ہوتے تو آپ کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں آواز بلند ہو جاتی اور جوش بڑھ جاتا۔ معلوم ہوتا کہ گویا آپ ایک ایسے لشکر سے ڈرا رہے ہیں جو صبح یا شام حملہ کرنے والا ہے۔ اور آپ فرماتے

(باقی ص ۳۶ پر)

تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل

(۵)

سیاسی جُز کو معطل کرنے کے دلائل و وجوہ جہاں تک میں معلوم کر سکا ہوں، وہ وجوہ جن کی بنا پر بعض ذہنوں میں لائحہ عمل کے سیاسی جُز کو معطل یا مؤخر کرنے کا تخیل پیدا ہوا ہے صرف تین ہیں، اور میں چاہتا ہوں کہ آپ ان کا بھی اچھی طرح جائزہ لے کر دیکھ لیں کہ آیا وہ ایسی کسی تجویز کے لیے واقعی معقول وجوہ ہیں۔

پہلی وجہ اور اس کا تنقیدی جائزہ پہلی اور سب سے بڑی، بلکہ اصلی وجہ جو مختلف مواقع پر میں نے سنی ہے، یہ ہے کہ ان کے نزدیک جماعت کی دینی و اخلاقی حالت گر گئی ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ پہلے سیاسی جدوجہد سے ہٹ کر کارکنوں کے اخلاق بنائے جائیں، پھر اس میدان میں واپس آیا جائے۔

اس کے متعلق میں یہ عرض کروں گا کہ اگر ساری جماعت بحیثیت مجموعی بگڑ گئی ہے تو اسے توڑ دیجیے، کیونکہ ہم بگاڑ کو سنوارنے کے لیے اٹھے تھے، بگڑی ہوئی جماعتوں میں ایک اور جماعت کا اضافہ کرنے کے لیے نہیں اٹھے تھے۔ لیکن اگر پورے مجموعے پر یہ ہمہ گیر حکم محض مبالغہ ہے، اور امر واقعی صرف اس قدر ہے کہ جماعت میں کچھ افراد معیار سے گرے ہوئے پائے جاتے ہیں، تو اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ سارا قافلہ ان چند افراد کی خاطر رک کر کھڑا ہو جائے، اور جب تک وہ درست نہ ہو جائیں آگے کا سفر ملتوی رہے۔ بلکہ اس کا صحیح علاج یہ ہے کہ جماعت کے معروف طریقے کے مطابق ایسے ناکارہ لوگوں کو یا تو درست کیجیے، یا پھر جماعت سے خارج کر دیجیے، مگر قافلہ کی راہ ایک لمحہ کے لیے بھی کھوٹی نہ کیجیے۔ جماعت اسلامی کی تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ یہ جماعت آخر کب اس طریقے پر عامل رہی تھی کہ جو لوگ ایک دفعہ اس کے نظام میں آ گئے ہوں وہ خواہ معیار پر قائم رہیں یا اس سے گر جائیں، ان کو ہر حال میں اپنے سینے سے چمٹائے رکھا جائے، اور ناکارہ لوگوں کو نکالنے کے بجائے جماعت اپنے پروگرام ان کی وجہ سے بدل دیا کرے؟ اس نے تو اول روز سے اپنے ہاں تنقید اور محاسبہ کا طریقہ اختیار کیا تھا تاکہ ہمیشہ کارکنوں کی حالت کا

جائزہ لے کر دیکھا جاتا رہے کہ وہ کم سے کم معیار جو رکنیت کے لیے مطلوب ہے، ان میں پایا جاتا ہے یا نہیں پھر جسے بھی معیار سے گرتے دیکھا جائے، اس کے تمام رفقاء اسے سنبھالنے کی فکر کریں، اور اگر وہ نہ سنبھلے تو پھر بادلِ ناخواستہ اسے رخصت کر دیا جائے۔ اس قاعدے کے مطابق ابتدا سے جماعت میں داخلے کا سلسلہ جس طرح چلتا رہا ہے اسی طرح اخراج کا سلسلہ بھی جاری رہا ہے، حتیٰ کہ سنہ ۴۵-۱۹۴۴ء میں ایک سال کے اندر تین سو ارکان کا اخراج تک عمل میں آچکا ہے[1]۔ یہ قاعدہ آج بھی آپ کی جماعت میں موجود ہے، اور آپ اس پر عمل کر کے جماعت کو ایسے تمام عناصر سے خالی کر سکتے ہیں جن کی دینی و اخلاقی حالت گر گئی ہو۔ ایسے لوگ اگر آپ کے اندر آج پائے جا رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی جماعت کے اس معروف قاعدے پر عمل کرنے میں کوتاہی کی ہے۔ اب یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اسے تازہ کرنے اور اس پر ٹھیک ٹھیک عملدرآمد کرنے کے بجائے ہمارے سامنے الٹی یہ تجویز لائی جاتی ہے کہ جماعت ان لوگوں کو اپنے اندر رکھنے کی خاطر اُس پروگرام میں رد و بدل کر ڈالے جو اس کے نصب العین کا لازمی تقاضا ہے۔

پھر میں کہتا ہوں کہ اگر اس پروگرام کے سیاسی جُز کو معطل کرنا اس لیے ناگزیر ہو گیا ہے کہ جماعت میں کچھ عناصر دینی و اخلاقی حیثیت سے گر گئے ہیں تو اس سے زیادہ۔ گزیر یہ ہے کہ دعوت و تبلیغ اور اصلاحِ معاشرہ اور توسیعِ جماعت کے کام کو بھی معطل کر دیا جائے، کیونکہ گری ہوئی دینی و اخلاقی حالت کے ساتھ دعوت الی اللہ کیسی، اور معاشرے کی اصلاح کے کیا معنی، اور صالح افراد کی تلاش و تنظیم کا کیا موقع؟ اس دلیل سے تو جماعت کا پروگرام اب صرف اپنے موجودہ ارکان کی تربیت تک محدود رہنا چاہیے، اور یہ طے ہو جانا چاہیے کہ جب تک سارے ارکان پورے معیاری رُکن نہ ہو جائیں، پبلک میں جا کر کوئی دعوتی یا اصلاحی یا سیاسی کام نہ کیا جائے۔ نیز یہ بھی طے ہو جانا چاہیے کہ جب بھی ارکان کی حالت کا جائزہ لینے کے بعد یہ پتہ چلے کہ تربیت کی ساری کوششوں کے باوجود پھر کچھ لوگ جماعت میں دینی و اخلاقی حیثیت سے گرے ہوئے پائے جاتے ہیں، تو پھر اسی طرح سارے پروگرام معطل کر کے جماعت تربیت گاہوں کی طرف

---

[1] روداد جماعت حصہ سوم صفحہ ۱۳۰-۱۴۰۔ واضح رہے کہ اُس سال کے آغاز میں ارکان کی کل تعداد ساڑھے سات سو تھی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ۴۰ فی صدی ارکان ناکارہ پا کر خارج کیے گئے۔

پلٹ جایا کرے گی۔ اس کے بعد یہ سوال خارج از بحث فرما دیجیے کہ یہ جماعت کبھی کوئی کام کر بھی سکے گی یا نہیں۔ میرے علم میں ایسا کوئی طریقِ تربیت اب تک نہیں آیا ہے جو معیارِ مطلوب کے آدمی تیار کرنے کی سو فی صدی ضمانت دیتا ہو۔ اس کی آپ جتنی چاہیں کوشش کر دیکھیں، ہر جائزہ آپ کو یہی رپورٹ دے گا کہ آپ کے درمیان ایک ناقابلِ اطمینان عنصر موجود ہے۔ بلکہ بحیثیتِ مجموعی پوری جماعت کے متعلق بھی ہر پہلو سے کامل اطمینان کی رپورٹ شاید آپ کبھی نہ پا سکیں گے۔ اب اگر یہ بات آپ ایک دفعہ طے کر لیں کہ ایسے جائزوں کا نتیجہ ہمیشہ آپ کے پروگراموں کو معطل کرنے ہی کی صورت میں نکلنا چاہیے تو میرے نزدیک اس کے بعد عقلمندی یہ ہے کہ آپ نظامِ زندگی کے انقلاب کی داستان لپیٹ کر رکھ دیں اور خانقاہیں بنانے کی تجویزیں سوچیں۔ اس کمزوری کے ساتھ آپ اجتماعی زندگی میں کبھی کوئی مؤثر کام نہیں کر سکتے۔

یہ تو ہے اس طرزِ فکر کا ایک کمزور پہلو۔ دوسرا اس سے بھی زیادہ کمزور پہلو یہ ہے کہ اس تجویز میں اخلاق بنانے اور مردانِ کار تیار کرنے کا ایک ایسا تصور کام کر رہا ہے جو بنیادی طور پر غلط ہے، اور میرے لیے یہ بات سخت حیرانی ہی نہیں، پریشانی کی موجب بھی ہے کہ سالہا سال سے ہم سیرت و اخلاق کی تیاری کے جس تصور کی اصلاح کے لیے کوشش کر رہے ہیں وہ ہمارے دائرے میں کیسے راہ پا گیا۔ یہ کہنا کہ جماعتِ اسلامی سیاسی جدوجہد کے میدان سے ہٹ کر پہلے کارکنوں کے اخلاق بنائے پھر اس میدان میں قدم رکھے، اپنے پیچھے اخلاق کی تیاری کا یہ تصور رکھتا ہے کہ ایک کام کے لیے جس قسم کے اخلاق کی ضرورت ہے وہ اس کام میں پڑے بغیر کہیں باہر سے تیار کر کے لائے جا سکتے ہیں۔ حالانکہ یہ تصور اتنا ہی غلط ہے جتنا یہ خیال غلط ہے کہ کوئی آدمی پانی میں اترے بغیر بھی تیراک ہو سکتا ہے۔ عقل اس کو غلط کہتی ہے، بارہا کے تجربات اس کو غلط ثابت کر چکے ہیں، ہمارا شب و روز کا مشاہدہ اس کی تردید کر رہا ہے۔ یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ ہر کام کے لیے جس قسم کے اخلاق مطلوب ہوتے ہیں وہ اسی کام میں پڑ کر بنتے ہیں۔ دعوت و تبلیغ کے لیے جو اخلاق درکار ہیں وہ دعوت و تبلیغ ہی میں بنیں گے، تجارت کے لیے جو اخلاق درکار ہیں وہ دکان اور منڈی ہی میں بنا کرتے ہیں۔ حجروں میں بیٹھ کر آپ دس برس بھی مشق و تمرین کریں، دعوت یا تجارت کے میدان میں قدم رکھتے ہی آپ کو محسوس ہو گا کہ یہاں جن آزمائشوں سے سابقہ ہے ان کے مقابلے میں اخلاقی حیثیت سے آپ بالکل مبتدی کے مقام پر ہیں۔ ایسا ہی معاملہ سیاست اور انتخابات کا بھی ہے۔

اس کام کی اخلاقی مشکلات، اور اس میں اترنے کے خطرات و نقصانات کو دیکھ کر آپ یہ فیصلہ کرنا چاہیں تو کر لیجیے کہ ہمیں اس میدان سے ہمیشہ کے لیے ہٹ جانا ہے۔ مگر یہ محض ایک خام خیالی ہے کہ آپ کا ارادہ تو اس میدان میں واپس ہی آنے کا ہو، لیکن آج آپ اس سے اس لیے ہٹ جائیں کہ چند سال تک آپ کہیں وہ اخلاق تیار کرتے رہیں گے جو سیاسی کام اور انتخابات میں حصہ لینے کے لیے درکار ہیں۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جتنے سال بھی آپ چاہیں اس میدان سے باہر تیاری کرتے رہیں آخر کار جب آپ پلٹ کر ادھر آئیں گے تو اپنے آپ کو آج کی حالت سے کچھ بھی بہتر نہ پائیں گے۔ یہاں جو اخلاقی قوت درکار ہے وہ باہر کسی جگہ سے بنا کر نہیں لائی جا سکتی۔ اس کا نشوونما اسی میدان میں شیطانی قوتوں سے نبرد آزمائی کر کے ہو سکتا ہے۔ اس کے ارتقاء کی صورت صرف یہ ہے کہ آپ اپنے کارکنوں کو ایک نصب العین اور ایک ضابطۂ اخلاق دے کر سیاسی جدوجہد کے عرصۂ کارزار میں لائیں اور سخت سے سخت نازک مواقع پر بھی انہیں اس نصب العین اور ضابطۂ اخلاق سے ہٹنے نہ دیں۔ انہیں انتخابی معرکے میں اُن پارٹیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے آگے بڑھائیں جو اخلاق و دیانت کے سارے اصولوں کو توڑ کر بازی جیتنے کی کوشش کرتی ہیں اور پھر اس امر کی پوری نگرانی کریں کہ انتخابی جنگ کی انتہائی گہما گہمی میں بھی آپ کے کارکن اخلاق کے کسی ضابطے اور دیانت کی کسی حد کو توڑنے نہ پائیں۔ ان آزمائشوں میں جن لوگوں سے کسی لغزش کا صدور ہو، ان پر گرفت کیجیے، جو قابلِ اصلاح ہوں ان کی اصلاح کی کوشش کیجیے اور دیکھیے کہ بعد کی آزمائشوں میں وہ کیسے ثابت ہوتے ہیں، اور جن کی حالت ناقابلِ اصلاح پائی جائے انہیں ہٹا کر پھینک دیجیے۔ یہ عملی تربیت اسی تربیت گاہ میں مل سکتی ہے۔ باہر کہاں آپ یہ تربیت دیں گے، اور کیسے آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ اخلاق جو اس کام کے لیے مطلوب ہیں، تیار ہوئے یا نہیں ہوئے؟

جماعت اسلامی کے لیے یہ کوئی نیا طریق تربیت نہیں ہے جو آج پہلی مرتبہ اس کے سامنے پیش کیا جا رہا ہو، بلکہ ۱۹۵۱ء کے انتخابات میں وہ اس کو آزما چکی ہے، اور اس کے نتائج کا جائزہ بھی آپ اس سے پہلے اچھی طرح لے چکے ہیں۔ اُس وقت انتخابات کے فوراً بعد آپ کی مجلسِ شوریٰ نے جو تبصرہ ایک طویل قرارداد کی شکل میں جماعت کے انتخابی کام پر کیا تھا اس کے یہ فقرے ملاحظہ ہوں:

"اس انتخابی جدوجہد کے دوران میں عام پبلک میں سے سترہ[*] سو ایسے نئے آدمی اٹھ کھڑے ہوئے جنہوں نے ہمارے کارکنوں کا پوری طرح سے ہاتھ بٹایا اور بغیر کسی ذاتی غرض یا لالچ کے اُن تمام اخلاقی پابندیوں کے ساتھ، جو ہم نے اپنے کارکنوں پر عائد کر رکھی تھیں، پوری طرح جان لڑا کر کام کیا۔"

"باوجودیکہ پنجاب کے اتنے وسیع رقبوں میں جماعت کے تین چار ہزار کارکنوں نے اتنے وسیع پیمانے پر انتخابی جدوجہد کی، اور اس میں مخالف جماعتوں اور امیدواروں کی شدید بد اخلاقیوں اور بے ضابطگیوں کا ان کو مقابلہ کرنا پڑا، تاہم پولنگ کے انتہائی بحرانی زمانے میں بھی جماعت کے کارکنوں نے بحیثیت مجموعی اخلاقی طہارت اور ضابطہ و قانون کی پابندی کا ایسا بے نظیر نمونہ پیش کیا جس کا اعتراف حکومت کے عُمّال اور مخالف پارٹیوں کے کارکنوں تک کو کرنا پڑا۔ الیکشن کے پورے کام کا جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ دو چار حلقوں کے سوا پورے پنجاب میں کہیں جماعت کے کارکنوں سے کسی اخلاقی کمزوری، یا قانون و ضابطہ کی خلاف ورزی کا ارتکاب نہیں ہوا، اور ان دو چار حلقوں میں بھی جماعت کے کارکن بحیثیت مجموعی اس میں ملوث نہیں ہوئے بلکہ چند منفرد کارکنوں ـــــ اور زیادہ تر نئے کارکنوں ـــــ سے اس کا صدور ہوا۔"

"خصوصیت کے ساتھ جو چیز ہمارے لیے قابلِ اطمینان ہے وہ یہ ہے کہ اس انتخابی جدوجہد میں جتنی خواتین نے پنچایتی نمائندوں کے لیے کام کیا انھوں نے ہر جگہ شرعی پردے کے تمام حدود کی پوری طرح پابندی کی۔ درانحالیکہ ایک آدھ پولنگ اسٹیشن کے سوا پورے پنجاب کا کوئی پولنگ اسٹیشن ایسا نہیں تھا جہاں زنانہ پولنگ کے وقت حکومت اور سیاسی پارٹیوں اور مخالف امیدواروں نے پردے کے حدود کا کچھ بھی لحاظ کیا ہو۔"

"جماعت کے کارکن پہلی مرتبہ انتخاب کے میدان میں اترے تھے۔ اکثر و بیشتر کو پہلے سے انتخاب کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ اور اخلاقی قیود اور قانون و ضابطہ کی پوری پابندی کے ساتھ الیکشن لڑنے کا تو موجودہ جمہوریت کی تاریخ میں شاید یہ پہلا تجربہ تھا۔"

[*] روداد مجلس شوریٰ، اپریل ۱۹۵۱ء، صفحہ ۱۰۰

"آئندہ ہر انتخاب کے موقع پر یہ بات نہ صرف کارکنانِ جماعت پر، بلکہ جماعت کی حمایت میں جو لوگ کام کریں اُن پر بھی اچھی طرح واضح کر دی جائے کہ جماعتِ اسلامی انتخاب میں کسی نشست کو جیتنے کی بہ نسبت زیادہ، اور بدرجہا زیادہ اہمیت اس امر کو دیتی ہے کہ انتخابات کو بداخلاقیوں اور بے ضابطگیوں سے پاک کیا جائے اور انتخابی جنگ میں اخلاقی حدود اور قانون و ضابطے کی پوری پوری پابندی کا نمونہ پیش کیا جائے۔ کیونکہ سیاست کو صداقت اور دیانت پر قائم کرنا جماعت اسلامی کے بنیادی مقاصد میں سے ایک ہے، اور اس مقصد کو ہم کسی بڑے سے بڑے وقتی فائدے پر بھی قربان کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس بنا پر مجلسِ شوریٰ نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ کسی ایسے رکنِ جماعت کو ہرگز معاف نہ کیا جائے جو کبھی انتخابی جدوجہد میں اخلاق اور ضابطے کے حدود سے تجاوز کرے۔ اور جماعت سے باہر کے جن لوگوں سے اس طرح کی حرکات کا صدور ہو آئندہ کے لیے ان کا تعاون قبول کرنے سے انکار کر دیا جائے[۲]۔"

یہ ہے وہ طریق تربیت جس کا آپ پہلے تجربہ کر چکے ہیں، اور یہ ہیں اس کے نتائج جو آپ کی مرکزی مجلس شوریٰ کے ۱۷ آدمیوں نے پورے انتخابی کام کا جائزہ لینے کے بعد ایک باقاعدہ قرارداد کی شکل میں بیان کیے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں، کیا یہ نتائج واقعی ایسے دل شکن اور مایوس کن ہیں کہ انہیں دیکھ کر آپ اس طریقے کو ناکام کہہ سکیں؟ اور کیا آپ سیاست اور انتخابات کے معرکے میں اترنے کے لیے یہ شرط لگانا چاہتے ہیں کہ تین چار ہزار آدمی اگر آپ میدان میں لائیں تو ان میں سے ایک کا کام بھی معیار سے گرا ہوا نہ پایا جا سکے؟ اور کونسا دوسرا طریقہ آپ تجویز کرتے ہیں جو اس میدان سے باہر آدمی تیار کرتا ہو اور پھر اس امر کی ضمانت دے کر انہیں میدان میں لا سکتا ہو کہ ہزار میں ایک آدمی بھی عملی تجربے میں ناقص نہ نکلے گا؟

اِس طرزِ فکر کا ایک کمزور پہلو اور بھی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جو حضرات یہ بات کہتے ہیں کہ اس وقت سیاست کے میدان سے ہٹ جائیے اور پھر چند سال اخلاق بنانے میں صرف

[۲] روداد مجلسِ شوریٰ، اپریل ۱۹۵۱ء، صفحہ ۲۲-۲۳-

کر کے پوری تیاری کے ساتھ واپس آبیٹھے۔ انھوں نے غالباً یہ فرض کر لیا ہے کہ ہم خلا میں کام کر رہے ہیں اور یہاں یہ بالکل آسان ہے کہ ہم جب چاہیں ایک جگہ سے ہٹ جائیں اور پھر جب چاہیں اسی جگہ آن کھڑے ہوں۔ حالانکہ امر واقعی جس سے ہم دو چار ہیں وہ یہ ہے کہ دس برس سے ہم سخت مزاحمتوں کے مقابلے میں اپنے نصب العین کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں، بہت سی طاقتیں ہیں جن سے ایک ایک قدم پر کشمکش کرتے ہوئے ہم اپنے موجودہ مقام پر پہنچے ہیں۔ اور وہ مخالف طاقتیں ہر وقت ہم کو ہٹانے اور دور پھینک دینے کے لیے زور لگا رہی ہیں۔ یہ کوئی خالی میدان نہیں ہے جس میں ہم ٹہلتے ہوئے آئے ہوں اور جا کر پھر ٹہلتے ہوئے ہی واپس آ سکتے ہوں۔ یہ تو مقابلے اور کشمکش کا میدان ہے جس میں ایک قدم بھی پیچھے ہٹ جائیے تو کھوئی ہوئی جگہ پر پلٹ کر آنا آسان نہیں ہوتا۔ اس لیے یہاں سے عام پسپائی کا فیصلہ محض خیالات کی چند لہروں سے متاثر ہو کر رواروی میں نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اول تو ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ سیاسی میدان میں کام کرنے سے وہ کونسا نقصان عظیم ہماری تحریک کو پہنچا ہے جس کے مقابلے میں یہ پورا میدان مخالف دین اور مخرب اخلاق طاقتوں کے لیے خالی چھوڑ دینا کم تر درجے کا نقصان سمجھا جا سکے اور اس نقصان کو گوارا کرنا ہمارے لیے ناگزیر ہو چکا ہو۔ دوسری یہ بات ہمارے سامنے واضح ہونی چاہیے کہ یہاں سے ہٹ کر ہم پھر یہاں واپس آ بھی سکیں گے؟ اس لیے کہ جو چند سال ہم اخلاقی تیاریوں میں صرف کریں گے، ان میں مخالف طاقتیں بیکار نہیں بیٹھی رہیں گی، بلکہ یہی چند برس وہ اپنی جڑیں مضبوط کرنے اور آپ کی واپسی کا دروازہ بند کرنے میں صرف کریں گی، اور ان کی کوشش یہ ہوگی کہ اس ملک میں دینی نظام کے لیے جدوجہد کرنے کے مواقع حتی الامکان بالکل ختم کر دیئے جائیں۔ ان دو سوالات کا کوئی اطمینان بخش جواب جب تک نہ ملے، سیاسی میدان سے پسپائی کی کوئی تجویز ہمارے لیے لائق غور بھی نہیں ہو سکتی، کجا کہ آنکھیں بند کر کے اسے صرف اس لیے قبول کر لیا جائے کہ جماعت کی اخلاقی حالت گرنے کا ایک خطرہ ہمارے سامنے پیش کر دیا گیا ہے جو بجائے خود واقعہ کے اعتبار سے بھی نہایت مبالغہ آمیز ہے۔

دوسری وجہ دوسری وجہ اس تجویز کے حق میں یہ پیش کی جاتی ہے کہ ہمارے پاس وہ لوگ تیار نہیں ہیں جو نظام حکومت کو اسلامی طرز پر چلانے کے لائق ہوں۔ اس حالت میں اگر محض سیاسی جدوجہد سے قیادت

میں کوئی تبدیلی ہو بھی جائے تو آخر وہ لوگ ہم کہاں سے لائیں گے جو ریاست کے مختلف شعبوں کی سربراہ کری اور رہنمائی اسلامی اصولوں کے مطابق کر سکیں ؟ اس لیے ہمیں پہلے وہ تدابیر اختیار کرنی چاہئیں جن سے ہر شعبۂ زندگی کے لیے موزوں معماروں اور لیڈروں کی ایک کھیپ تیار ہو جائے - پھر تبدیلی قیادت کی جدوجہد با موقع بھی ہوگی اور نتیجہ خیز بھی۔

یہ استدلال خود ظاہر کر رہا ہے کہ اس سارے معاملے کو بڑے ہی سطحی انداز میں سوچا گیا ہے۔ اس کی پشت پر کئی غلط مفروضے کام کر رہے ہیں۔ جن لوگوں کے ذہن میں یہ استدلال پیدا ہوا ہے انھوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ یہاں صرف تبدیلی قیادت کے لیے ایک سیاسی جدوجہد کی جا رہی ہے، اس کے ساتھ کوئی تحریک ذہنی و فکری اور اخلاقی تبدیلی کے لیے کام کرنے والی نہیں ہے۔ انہوں نے یہ بھی فرض کر لیا ہے کہ سیاسی جدوجہد سے انقلاب قیادت اچانک رونما ہو جائے گا اور یکبارگی یہ سوال عملاً ہمارے سامنے آکھڑا ہوگا کہ زمام کار تو اسلامی نظام کے حامیوں کے ہاتھ میں آگئی ہے، اب اس نظام کے مطابق تعمیر نو کے لیے آدمی کہاں سے لائے جائیں۔ اس کے ساتھ انہوں نے ایک تیسری بات یہ بھی فرض کر لی ہے کہ نظام زندگی کی تبدیلی کے لیے جو تحریک کسی ملک میں کام کر رہی ہو اسے پہلے کہیں الگ بیٹھ کر اپنے نظام مطلوب کے لیے آدمی تیار کرنے چاہئیں اور جب اس کے پاس مختلف شعبوں کو چلانے کے لیے ڈائرکٹروں، مدبروں، سپہ سالاروں، اور دوسرے ماہرین کی ایک کافی تعداد تیار ہو جائے تب اسے نظام مملکت کا چارج لینے کے لیے آگے بڑھنا چاہیے۔ یہ تین مفروضے جب تک صحیح نہ ہوں، ان پر تعمیر کردہ استدلال صحیح نہیں ہو سکتا، اور میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص تھوڑے سے غور و فکر سے بھی کام لے گا وہ محسوس کرے گا کہ یہ تینوں ہی مفروضے غلط ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اچانک تبدیلی تو خفیہ سازشی تحریکوں اور مسلح انقلاب کے ذریعہ سے بھی کم ہی رونما ہوتی ہے، کجا کہ جمہوری راستوں سے رونما ہو جائے۔ اصول اور نظریات کی بنیاد پر نظام زندگی کی تبدیلی کے لیے جو تحریکیں جمہوری اور آئینی طریقوں سے جدوجہد کرتی ہیں ان کے نتیجے میں ہر تبدیلی تدریجاً اور رفتہ رفتہ ہوتی ہے اور کبھی یکبارگی یہ سوال ان کے لیے پیدا نہیں ہوتا کہ نظام تو بدل گیا ہے مگر اس کے

چلانے والے آدمی موجود نہیں ہیں۔ واقعات کی دنیا میں صورت معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے یعنی نظام بدلتا ہی اس وقت ہے جبکہ آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کی رائے، ذہنیت، طرزِ فکر اور معیار پسند و ناپسند میں تغیر رونما ہو جاتا ہے۔ اور یہ تغیر آپ سے آپ اس بات کی ضمانت ہوتا ہے کہ اسی آبادی میں سے، جس نے یہ تغیر قبول کیا ہے، نئے نظام کو چلانے والے آدمی فراہم ہو جائیں گے۔

اس تغیر کی رفتار بہت سست ہوتی ہے جبکہ اس کے لیے کوشش کرنے والی تحریک زندگی کے بڑکتے ہوئے مسائل و معاملات میں دخل دینے اور مخالف تحریکوں اور طاقتوں کے ساتھ زور آزمائی کرنے سے گریز کرے۔ کیونکہ اس صورت میں تھوڑے لوگ ہی اس کو مجرد اس کے خیالات اور اس کی ٹھنڈی تعمیری کوششوں کی بنا پر قابلِ اعتنا سمجھتے ہیں۔ لیکن جب وہ اپنے نظریات کی تبلیغ و دعوت کے ساتھ آگے بڑھ کر ہر عملی مسئلے میں دخل دیتی ہے، اس میں اپنا نقطۂ نظر دلائل کے ساتھ پیش کرتی ہے، مخالف قوتوں کی فکر و عمل پر مدلل تنقید کرتی ہے، اور عملاً ان قوتوں کے مقابلہ میں کشمکش شروع کر دیتی ہے، تو روز بروز آبادی کا زیادہ سے زیادہ حصہ اس کی طرف متوجہ ہوتا چلا جاتا ہے اور اگر اس کی تنقید اور تعمیری فکر اور سیرت و کردار میں کوئی جان ہوتی ہے تو ہر شعبۂ زندگی میں کام کرنے والے لوگ اس کے ہم خیال بنتے چلے جاتے ہیں۔ کشمکش، اور خصوصاً جبکہ وہ زندگی کے عملی مسائل پر ہو، لمبی چوڑی کتابوں کے بغیر خود لوگوں کو یہ سمجھا دیتی ہے کہ آپ جس چیز کو توڑنا چاہتے ہیں اس میں کیا خرابی ہے اور جو کچھ بنانا چاہتے ہیں وہ کیا ہے اور کن اصول و نظریات پر مبنی ہے۔ اس کا کم از کم ایک واضح خلاصہ ہر اس شخص کا ذہن اخذ کر لیتا ہے جو ماحول میں سانس لے رہا ہو، اور کشمکش جتنی بڑھتی جاتی ہے اتنے ہی زیادہ لوگ اس سے متاثر ہو کر اپنی اپنی استعداد کے مطابق تبدیلی قبول کرتے چلے جاتے ہیں۔

اس طرح کی ایک تحریک کو کبھی اس کی ضرورت پیش نہیں آتی کہ کہیں باہر سے آدمی تیار کر کے لائے۔ وہ اپنی تبلیغ اور اپنی جدوجہد کی تاثیر سے بنے بنائے آدمیوں کو تبدیل (CONVERT) کر کے اپنا ہم خیال و ہم نوا بنا لیتی ہے، اور اس کی یہ تبلیغ اور جدوجہد چونکہ کسی خلا میں نہیں ہوتی بلکہ اسی معاشرے میں ہوتی ہے، اس لیے کوئی شعبۂ حیات ایسا نہیں رہ جاتا جس میں کام کرنے والے لوگ اس کے پھیلائے ہوئے اثرات سے کم و بیش

متأثر نہ ہوتے ہوں یہی متأثرین اُس وقت کام آتے ہیں جب تحریک کی تدریجی ترقی سے ایک وقت عملاً قیادت تبدیل ہو جاتی ہے۔

پھر یہ خیال بھی غلط ہے کہ کسی نظام کو چلانے والے لوگ کہیں الگ سے تیار کر کے لائے جا سکتے ہیں۔ یہ چیز کسی کارخانے میں ڈھلنے والی یا کسی معمل (لیبارٹری) میں تیار ہونے والی نہیں ہے۔ برسوں کے تجربے اور عملی کام سے اس طرح کے لوگ تیار ہوا کرتے ہیں۔ اس سوال کو تھوڑی دیر کے لیے جانے دیجیے کہ آپ وہ وسائل کہاں سے فراہم کریں گے جن سے اعلیٰ درجے کے مدبرین و منتظمینِ مملکت تیار کرنے والے ادارے قائم کر سکیں۔ اس کو ممکن تسلیم کر کے بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ ان اداروں میں تعلیم و تربیت پائے ہوئے لوگ کیا پہلا ہی قدم ہر شعبے اور محکمے کی مسندِ صدارت پر رکھنے کے قابل ہوں گے؟

مزید برآں ہمارا ملک جس جمہوری طرز پر چل رہا ہے، اس میں نظامِ زندگی کی تبدیلی لانے کے لیے بہر حال یہ ناگزیر ہے کہ ہمارے ارکان اور متفقین کی ایک کثیر تعداد عملاً اس جمہوری طرزِ حکومت کی پوری مشینری سے واقف ہو اور اس کے کام چلانے میں مہارت پیدا کرے۔ یہ واقفیت اور مہارت کہیں باہر سے حاصل کر کے نہیں لائی جا سکتی، اسی کام میں پڑ کر بتدریج پیدا کی جا سکتی ہے۔ انتخابی کام کے تجربہ کار خود انتخابات ہی میں تیار ہوں گے۔ پارلیمنٹیرین پارلیمنٹ میں جا کر ہی بنیں گے۔ حکومت کے مختلف شعبوں میں بصیرت اسی وقت پیدا ہو گی جبکہ ایوانِ ریاست میں جا کر آپ کے کارکنوں کو براہِ راست ملکداری کے مسائل و معاملات سے دوچار ہونے کا موقع ملے۔ اس کام کو جتنی مدت بھی آپ چاہیں ملتوی کر لیں، بہرحال جب بھی آپ اس طرف آئیں گے بسم اللہ ہی سے آپ کو آغاز کرنا پڑے گا۔ کوئی وقت ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ ساری مہارتیں اور بصیرتیں کہیں سے پیدا کیے ہوئے آئیں اور آتے ہی بس مملکت کا چارج لے لیں۔

اب رہ جاتا ہے یہ مفروضہ کہ یہاں محض سیاسی جدوجہد ہی سے قیادت کی تبدیلی چاہی جا رہی ہے اور اس کے ساتھ کوئی متوازی کوشش ذہنی و فکری اور اخلاقی تبدیلی کے لیے نہیں ہو رہی ہے، تو اس کے متعلق میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ خلافِ حقیقت باتوں پر استدلال کی عمارت اٹھانا اُس نقطۂ نظر کی کمزوری کا پہلا نشان ہے جس کے حق میں استدلال کا یہ طریقہ اختیار کیا جائے۔ آخر کون آدمی، جو جماعت اسلامی کے

حالات سے واقف ہے، انصاف کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم آج تک محض سیاسی جدوجہد کے ذریعہ سے تبدیلی قیادت کے لیے کوشاں رہے ہیں؟ اور کون ہمارے اس چار نکاتی لائحہ عمل کو، جو اس وقت زیرِ بحث ہے، یہ معنی پہنا سکتا ہے کہ آئندہ کے لیے ہم ایسا کوئی نقشہ کار بنا رہے ہیں؟ ہمارا تو سارا منصوبہ یہی ہے کہ ایک طرف منظم طریقے سے وسیع پیمانے پر ذہنی و فکری اور اخلاقی تبدیلی لانے کی کوشش کی جائے، دوسری طرف قیادت بدلنے کے لیے سیاسی میدان میں لادینی نظام کی ان طاقتوں کے خلاف کشمکش کی جائے جو اس وقت زمامِ کار پر قابض ہیں یا آئندہ قابض ہونا چاہتی ہیں۔ اور یہ منصوبہ ہم نے اختیار ہی یہ سمجھتے ہوئے کیا ہے کہ اس طرح جس تدریج کے ساتھ زمامِ کار تبدیل ہو گی اسی کے مطابق ساتھ کے ساتھ نئے نظام کے چلانے والے بھی تیار اور فراہم ہوتے چلے جائیں گے۔ اب اگر کوئی شخص اس منصوبے سے سیاسی جدوجہد کے عنصر کو نکالنا چاہتا ہو تو اسے سیدھی طرح یہ بتانا چاہیے کہ وہ کیسے اور کہاں وہ مردانِ کار تیار کرے گا جن کی تیاری و فراہمی اس کی رائے میں سیاسی جدوجہد شروع کرنے کے لیے شرط مقدم ہے۔ یہ سیدھی راہ چھوڑ کر ایک بالکل خلافِ واقعہ مفروضے کا سہارا لینا کسی طرح درست نہیں ہے۔

تیسری وجہ ایک اور وجہ اس تجویز کے لیے یہ بیان کی جاتی ہے کہ ابھی تو ہم نے علمی میدان میں اُس درجے اور پیمانے کا کوئی کام کیا ہی نہیں ہے جو فکری و نظری قیادت بدلنے کے لیے کافی ہو سکے۔ اور فکری و نظری قیادت بدلے بغیر سیاسی قیادت بدلنا نہ تو ممکن ہی ہے اور نہ مفید۔ اس لیے ہمیں سیاسی قیادت کی تبدیلی کا خیال چھوڑ کر اپنی پوری قوت علمی کام پر صرف کرنی چاہیے۔ آخر کار جب ہم علوم و فنون کی وہ ساری بنیادیں ڈھا دیں گے جو موجودہ لادینی تہذیب کی اساس بنی ہوئی ہیں، اور ان کی جگہ اسلامی افکار کی نئی بنیادیں علوم کی تدوینِ جدید کے ذریعہ سے مستحکم کر دیں گے، تو اس سے خود بخود ایک انقلاب رونما ہو گا جو سیاست سمیت ہر شعبۂ زندگی میں قیادت کو تبدیل کر دے گا۔

یہ دراصل ایک دوسری ہی نوعیت کا نقشہ کار ہے جسے اگر اختیار کرنا ہو تو آپ کو اپنی تحریک کے لائحہ عمل سے اس کا صرف چوتھا جزہی خارج نہیں کرنا ہو گا، بلکہ باقی تینوں اجزاء کو بھی ختم کر دینا ہو گا۔ کیونکہ اس نقشے کی رو سے تو دعوتِ عام، تنظیمِ افرادِ صالح، اور اصلاحِ معاشرہ کا کام بھی قبل از وقت اور محض لاحاصل ہے۔

یہی نہیں، بلکہ پچھلے پندرہ بیس سال میں ہم اپنے نصب العین کے لیے جو کچھ بھی کرتے رہے ہیں وہ سب فضول تھا اور محض ناسمجھی کی وجہ سے ہم ایک غلط راستے پر پڑ گئے تھے۔ اس کے بجائے جو کچھ ہمیں کرنا چاہیے تھا اور جو کچھ اب کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ ایک عظیم الشان اکیڈمی قائم کریں جو علوم کی تحقیق و تنقید اور تدوینِ جدید کا کام شروع کرے، پھر جب یہ اکیڈمی اپنے نتائجِ عمل سے ہم کو اس حد تک مسلح کر دے کہ ہم ایک یونیورسٹی قائم کر سکیں تو ہمیں دوسرا قدم اُس کی تاسیس کا اٹھانا چاہیے۔ اس کے بعد جو کچھ کرنا ہوگا اسے ابھی سے سوچنے کی کوئی حاجت نہیں، کیونکہ ۶۰-۷۰ برس تک کے لیے تو یہ پروگرام ہمارے پاس موجود ہی ہے! رہی یہ بات کہ ایک نظام کی گود میں بیٹھ کر دوسرے نظام کے لیے یہ انقلاب انگیز تعمیری ادارے کہاں کن وسائل سے قائم ہونگے، اور غالب نظام کا ہمہ گیر استیلا ان کو کام کرنے کا موقع کس حد تک دیگا، اور خود اس نظامِ غالب کے اپنے وسیع و عمیق علمی و فکری اثرات اس مدت میں کس پیمانے پر اپنا کام کر چکے ہونگے، تو یہ وہ سوالات ہیں جو اس عالمِ خیال میں سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتے جہاں بیٹھ کر یہ نقشۂ کار سوچا گیا ہے۔

دراصل یہ محض ایک سرسری تخیل ہے جسے اچھی طرح سمجھے بغیر اور پھر غور و فکر کی زحمت اٹھائے بغیر ناپختہ حالت میں پیش کر دیا گیا ہے۔ میں چند الفاظ میں اس پر تنقید کر کے بتاؤں گا کہ اس میں خامی کیا ہے، اور جس چیز کی ضرورت کا اس میں اظہار کیا جا رہا ہے وہ ہماری تحریک میں پہلے ہی کس طریقے سے پوری ہو رہی ہے۔

اس میں یہ فرض کیا گیا ہے کہ کسی نظریۂ حیات کے مطابق سیاسی انقلاب رونما ہونے کی واحد صورت یہ ہے کہ اس سے پہلے اُس نظریے کے مطابق فکری انقلاب رونما ہو جائے۔ حالانکہ ایسا ہونا کچھ ضروری نہیں ہے۔ خود ہمارے ملک میں انگریزوں نے آکر پہلے خالص سیاسی تدبیروں سے اقتدار پر قبضہ کیا، پھر اسی ملک کے ذرائع و وسائل سے کام لے کر اپنے نظریۂ حیات کے مطابق افکار، اخلاق، اطوار، تہذیب، تمدن، ہر چیز کی دنیا بدل ڈالی۔ یہاں یہ فکری و تہذیبی انقلاب سیاسی انقلاب کی علت نہیں بلکہ اس کا نتیجہ تھا۔ اسلام کی اپنی تاریخ بتاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداءً صرف ایک مٹھی بھر جماعت اسلامی طرزِ فکر کی [illegible] تیار کی تھی۔ اس کے بعد سیاسی انقلاب فکری و اخلاقی انقلاب کے ساتھ اس طرح متوازی چلتا رہا کہ دونوں کی تکمیل ایک ساتھ واقع ہوئی۔ وہاں ان دونوں قسم کی مساعی کو ہم ایک دوسرے کا ایسا مددگار پاتے ہیں کہ ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ آیا سیاسی انقلاب فکری و اخلاقی انقلاب کا نتیجہ تھا یا فکری و اخلاقی انقلاب

سیاسی انقلاب کا نتیجہ۔ اس لیے یہ بات ایک کلیہ کے طور پر نہیں کہی جا سکتی کہ سیاسی انقلاب کے لیے فکری انقلاب لازماً ایک شرطِ مقدم ہے۔ در حقیقت جس چیز کو شرطِ مقدم کہا جا سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ایک ایسا منظم گروہ پیدا ہو جائے جو ایک فکر کا حامل بھی ہو اور اس فکر کو عملی جامہ پہنانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ ایسا گروہ جب وجود میں آ جائے تو پھر یہ امر حالات اور مواقع پر منحصر ہے کہ وہ اپنے مقصود کی طرف کس راستے سے بڑھے۔ اگر سیاسی تغیر ممکن ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ محض ایک خیالی نظریہ کی بنا پر وہ اس امکان سے فائدہ اٹھانے میں تامل کرے۔ وہ ایسا کر سکتا ہے کہ اقتدار اور وسائل کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد پورے نظامِ زندگی کو اپنے نقطۂ نظر کے رخ پر موڑنے کی ویسی ہی کوشش کرے جیسی انگریز یہاں بڑی کامیابی کے ساتھ کر کے دکھا چکے ہیں اور انبیائے کرام میں بھی اس طریق کار کی مثال حضرت یوسف علیہ السلام کی حیاتِ طیبہ میں ملتی ہے۔ اسی طرح وہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ فکری انقلاب اور سیاسی تغیر کی ایک ساتھ کوشش کرے، یعنی جس قدر طاقت فکری دعوت پھیلانے سے حاصل ہو اسے سیاسی تغیر کے لیے استعمال کرے، اور جتنی طاقت سیاسی تغیر کی سعی و جہد سے حاصل ہو اس سے فکری انقلاب کو اور زیادہ وسیع و عمیق کرنے کی کوشش کرتا چلا جائے۔ یہ وہ طریق کار ہے جو ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا۔

دوسری ایک غلط بات اس خیالی نقشۂ کار میں یہ فرض کی گئی ہے کہ فکری انقلاب برپا کرنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم تحقیق و تدوینِ علوم کے ادارے قائم کر کے اپنے نظریۂ حیات کے مطابق ایک پورا نظامِ فکر تفصیلاً مرتب کر دیں، پھر اپنے تعلیمی ادارے قائم کر کے ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی پیدا کریں جو اس نظامِ فکر کے مطابق ذہنی تربیت پائے ہوئے ہوں۔ حالانکہ اس مقصد کے حصول کا بھی ایک طریقہ نہیں ہے۔ اس کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ہم جس نظام کو بدلنا چاہتے ہیں اس کی خرابیاں اور جس نظام کو لانا چاہتے ہیں اس کے امتیازی خدوخال مجمل مگر واضح اور مدلل و مؤثر طریقے سے پیش کر کے ایک عملی جدوجہد کا آغاز کر دیں۔ پھر زندگی کے تمام اہم مسائل میں، جو وقتاً فوقتاً ملک کو درپیش ہوں، بروقت دخل دے کر اپنے نقطۂ نظر کی ترجمانی کریں، اور اسی بنیاد پر مخالف نظریات کے مقابلے میں اپنے نظریے کو غالب کرنے کی کوشش کرتے چلے جائیں، یہاں تک کہ یہ کشمکش اس قدر عام، اس قدر شدید، اور اس قدر نمایاں ہو جائے کہ معاشرے

کا کوئی طبقہ اس کی طرف توجہ کیے بغیر نہ رہ سکے۔ اس طریقے سے لازماً ایک عام فکری حرکت رونما ہوگی جس سے معاشرے کے دوسرے طبقات کی طرح اہل علم، اہل قلم، اصحاب درس و تدریس، اور تعلیم خوردہ نوجوان بھی متاثر ہونگے۔ یہ حرکت جہاں کچھ لوگوں کو ہماری مخالفت پر اُبھاریگی، کچھ دوسرے لوگوں کا زاویہ فکر و نظر ہماری موافقت میں بھی تبدیل کریگی۔ اور یہی بدلے ہوئے ذہن آخرکار خود اپنی افتادِ طبع سے وہ علمی اور تعلیمی خدمت انجام دینا شروع کردیں گے جس کی ضرورت ظاہر کی جارہی ہے۔ ان میں سے جو جس شعبۂ علم سے متعلق ہوگا اور جس پوزیشن میں بھی کام کر رہا ہوگا، وہاں اس کی قابلیتیں اسی سمت میں کام کریں گی جس پر ایک ابتدائی فکری حرکت اسے موڑ چکی ہوگی۔ اس کے بعد جب یہ کشمکش اور زیادہ ترقی کرکے ملک کے سیاسی نظام میں تغیر پیدا کرنا شروع کردیگی تو ہمیں اپنے ادارے الگ قائم کرنے کی حاجت نہ رہے گی۔ یہی محکمۂ تعلیم، یہی مدرسے، یہی کالج، یہی یونیورسٹیاں، اور مختلف قسم کی تربیتوں کے یہی سرکاری ادارے جو آج موجود ہیں وہ کام کرنے لگیں گے جس کے لیے ایک ادارۂ تحقیقات اور ایک درسگاہ کی ضرورت ظاہر کی جارہی ہے۔

اب یہ کہنے کی حاجت نہیں کہ ہم کئی سال سے اسی دوسرے طریقے پر فکری انقلاب لانے کی کوشش کر رہے ہیں، اور ہماری یہ کوشش ایک طرف عمومی اصلاح اور دوسری طرف سیاسی تغیر کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ متوازی چل رہی ہے۔ اگر عملاً یہ ممکن ہوتا اور اس کے لیے ذرائع و وسائل ہم پہنچتے تو ہم صرف ایک نہیں متعدد تحقیقی اور تعلیمی ادارے اب تک قائم کرچکے ہوتے۔ آج بھی اس کے مواقع ہمیں مل جائیں تو ہم یہ کام کرنے میں ایک لمحہ کے لیے بھی تامل نہ کریں۔ کیونکہ یہ کام ہماری اسکیم میں شامل ہے اور اس کی ضرورت اور اس کے فوائد سے ہم نہ کبھی غافل تھے، نہ اب غافل ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ کام مقصود بالذات نہیں، محض ایک ذریعہ ہے جبکہ یہ اس ہمہ گیر اصلاح و تغیر کی جدوجہد کے ساتھ چلے جس میں ہم کئی سال سے منہمک ہیں۔ اس کو چھوڑ کر صرف ایک ہی کام پر اپنی مساعی کو مرکوز کردینا ہماری نگاہ میں ایک بڑی نادانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ جو کچھ ہم نے اب تک کیا ہے وہ بھی ضائع ہو اور جو کچھ ہم آگے بنانا چاہیں وہ بھی شاید نہ بنا سکیں۔

یہ ہے ان وجوہ و دلائل کی کل کائنات جو تحریکِ اسلامی کے لائحۂ عمل میں سے اس کے سیاسی جزو کو خارج یا سردست ملتوی رکھنے کے حق میں اب تک مجھے معلوم ہو سکے ہیں۔ ان کے سوا اگر اور بھی کچھ وجوہ ہوں تو ہم سب ضرور ان کو معلوم کرنا چاہیں گے اور ٹھنڈے دل سے ان پر غور کریں گے۔ لیکن یہ وجوہ، جن پر ابھی میں نے آپ کے سامنے تبصرہ کیا ہے، ایسی کسی تجویز کے لیے میرے نزدیک کسی پہلو سے بھی کافی نہیں ہیں۔ بہرحال آخری فیصلہ اجتماعِ ارکان کے اختیار میں ہے کہ وہ انہیں کافی تسلیم کرتا ہے یا نہیں۔

نکتۂ ہشتم اس بحث کے بعد قرارداد کے آٹھویں نکتے پر کچھ زیادہ گفتگو کرنے کی حاجت نہیں رہتی۔ جس میں دو باتوں پر یکساں زور دیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ لائحۂ عمل کے ان چاروں اجزاء پر توازن کے ساتھ کام کرنا ضروری ہے۔ دوسرے یہ کہ توازن قائم نہ رہنے کو کسی حالت میں اس امر کے لیے دلیل نہ بنایا جا سکے گا کہ ان اجزاء میں سے کسی جزء کو ساقط یا مؤخر کر دیا جائے۔

ان میں سے پہلی بات کے متعلق صرف یہ کہنا کافی ہے کہ یہ لائحۂ عمل جس اسکیم پر مبنی ہے اس کی کامیابی کا سارا انحصار ہی اس کے توازن پر ہے۔ اس کا ہر جزء دوسرے اجزاء کا مددگار ہے، اس سے تقویت پاتا ہے اور اس کو تقویت بخشتا ہے۔ آپ کسی جزء کو ساقط یا معطل کریں گے تو ساری اسکیم خراب ہو جائے گی۔ اور اس کے اجزاء کے درمیان توازن برقرار نہ رکھیں گے تب بھی یہ اسکیم خراب ہو کر رہے گی۔ کامیابی کی صورت صرف یہ ہے کہ ایک طرف دعوت و تبلیغ پیہم جاری رکھیے تاکہ ملک کی آبادی زیادہ سے زیادہ آپ کی ہم خیال ہوتی چلی جائے۔ دوسری طرف ہم خیال بننے والوں کو منظم اور تیار کرتے جائیے تاکہ آپ کی طاقت اسی نسبت سے بڑھتی جائے جس نسبت سے آپ کی دعوت وسیع ہو۔ تیسری طرف معاشرے کی اصلاح و تعمیر کے لیے اپنی کوششوں کا دائرہ اتنا ہی بڑھاتے چلے جائیے جتنی آپ کی طاقت بڑھے، تاکہ معاشرہ اس نظامِ صالح کو لانے اور سہارنے کے لیے زیادہ سے زیادہ تیار ہوتا جائے جسے آپ لانا چاہتے ہیں۔ اور چوتھی جانب ملک کے نظام میں عملاً تغیر لانے کے جو آئینی ذرائع موجود ہیں ان سے پورا پورا کام لینے کی کوشش کیجیے تاکہ ان تغیرات کو لانے اور سہارنے کے لیے آپ نے معاشرے کو جس حد تک تیار کیا ہو اس کے مطابق واقعی تغیر رونما ہو سکے۔ ان چاروں کاموں کی مساوی اہمیت آپ کی نگاہ میں ہونی چاہیے۔ ان میں سے

کسی کو کسی پر ترجیح دینے کا غلط خیال آپ کے ذہن میں پیدا نہ ہونا چاہیے۔ ان میں سے کسی کے بارے میں غلو کرنے سے آپ کو پرہیز کرنا چاہیے۔ آپ کے اندر یہ حکمت موجود ہونی چاہیے کہ اپنی قوتِ عمل کو زیادہ سے زیادہ صحیح تناسب کے ساتھ ان چاروں کاموں پر تقسیم کریں۔ اور آپ کو وقتاً فوقتاً یہ جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ ہم کہیں ایک کام کی طرف اس قدر زیادہ تو نہیں جھک پڑے ہیں کہ دوسرا کام رک گیا ہو، یا کمزور پڑ گیا ہو۔ اسی حکمت اور متوازن فکر اور متناسب عمل سے آپ اُس نصب العین تک پہنچ سکتے ہیں جسے آپ نے اپنا مقصدِ حیات بنایا ہے۔

اب رہی دوسری بات جو اس نکتے میں کہی گئی ہے، تو اسے سمجھنے کے لیے کچھ بہت زیادہ غور و فکر کی بھی حاجت نہیں ہے۔ ایک سیدھی اور صاف بات ہے جسے سیدھے اور صاف طریقے سے ہر صاحب عقل آدمی آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔ توازن ایک عقلی چیز ہے، کوئی مادّی چیز نہیں ہے جسے ناپ تول کر فیصلہ کیا جا سکے کہ وہ برقرار رہا یا نہ رہا۔ ایک شخص جماعت کے حالات اور کام کو دیکھ کر یہ اندازہ کر سکتا ہے، کہ وہ برقرار نہیں رہا ہے۔ دوسرا شخص یہی سب کچھ دیکھ کر رائے قائم کر سکتا ہے کہ وہ پوری طرح برقرار ہے یا اُس سے زیادہ نہیں بگڑا ہے جتنا اجتماعی کاموں میں اس کا بگڑ جانا ایک فطری امر ہے۔ ایسی ایک چیز کو، جس کا مدار اندازوں پر ہو، اور جس میں مختلف لوگوں کے اندازے مختلف ہو سکتے ہوں، اس حد تک اہمیت دینا صحیح نہیں ہو سکتا کہ جماعت میں ہر وقت اس کی بنیاد پر لائحہ عمل کی شکست و ریخت کا دروازہ کھلا رہے اور آئے دن اس کے بدلنے اور نئے سرے سے بنانے کی کوششیں اٹھتی رہیں۔ تاہم اگر توازن کے متعلق ناپ تول کر کوئی ایسا فیصلہ کرنا ممکن بھی ہو جس میں دو رائیوں کی گنجائش نہ رہے، تب بھی ایک قسم کے عدمِ توازن کو دوسری قسم کا عدمِ توازن پیدا کرنے کے لیے دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ اس بنیاد پر کہا جا سکتا ہے وہ بس یہی ہے کہ اگر توازن بگڑ گیا ہے تو اس کو پھر سے قائم کرنے کی کوشش کی جائے، نہ یہ کہ اگر اب تک ایک رُخ پر توازن بگڑ رہا ہے تو اب اسے دوسرے رخ پر بگاڑ دیا جائے۔

اس معاملے کو آپ ایک مثال سے بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ ایک نسخہ ہے جس میں چار اجزاء مساوی الوزن رکھے گئے ہیں۔ کچھ مدت کے بعد آپ پر یہ منکشف ہوتا ہے کہ آپ ایک جز کی مقدار بہت زیادہ

استعمال کرتے رہے ہیں اور بقیہ تین اجزاء کا تناسب آپ کے زیرِ استعمال مرکب میں کم ہو گیا ہے۔ اب کوئی اناڑی طبیب ہی ہو گا جو آپ کو یہ مشورہ دے گا کہ آئندہ چھ مہینے تک آپ صرف وہی تین اجزاء استعمال کرتے رہیں جو مقررہ مقدار سے کم استعمال ہوتے ہیں، اور چوتھے جزء کو سرے سے ساقط کر دیں۔

اس توازن کی بحث میں غلط فہمی کی ایک اور وجہ بھی ہے جسے نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ عموماً جب کوئی صاحب یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جماعت کے کام میں لائحۂ عمل کے چاروں اجزاء کا توازن قائم نہیں رہا ہے تو ان کی گفتگو سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اس کے ہر جزء پر عمل صرف وہی ہے جو اُس خاص جزء کے نام سے کیا جائے۔ مثلاً دعوت کا کام وہ صرف اُس کو شمار کریں گے جس پر "دعوت" کا ٹھپّہ لگا ہوا ہو، اور اصلاحِ معاشرہ کا کام اُن کے خیال میں صرف وہ ہو گا جو اسی مخصوص نام کے ساتھ کیا گیا ہو۔ رہے وہ کام جن پر "سیاست" کا عنوان چسپاں ہو تو وہ اسے "سیاسی کام" کے خانے میں ڈال دینگے اور یہ تسلیم نہ کریں گے کہ اس عنوان کے تحت دعوت، توسیعِ نظام، اور اصلاحِ معاشرہ کا بھی کوئی کام ہوا ہے۔ اس طرح بعض لوگوں نے مختلف عنوانات کے خانوں میں جماعت کے کام کو تقسیم کر رکھا ہے اور زیادہ تر یہی چیز اُن کے اس دعوے کی بنیاد ہے کہ جماعت کا سیاسی کام اس کے دوسرے کاموں سے بہت بڑھ گیا ہے۔ حالانکہ ہم جو اپنے لائحۂ عمل میں چار عنوانوں پر کام کو تقسیم کر کے بیان کرتے ہیں تو وہ صرف یہ سمجھانے کے لیے ہے کہ زندگی کے کن کن گوشوں میں ہمیں کن مقاصد کے لیے سعی کرنی ہے۔ اس کا یہ مطلب کبھی نہیں ہوتا، اور نہیں ہو سکتا کہ عملاً بھی یہ الگ الگ کام ہونگے۔ واقعہ کے اعتبار سے تو ان میں سے ہر کام ایسا ہے جس میں آپ سے آپ بقیہ سارے کام بھی شامل ہوتے ہیں۔ جب آپ دعوت کا کام کریں گے تو وہ مذہبی واعظوں کے طرز پر صرف دعوت ہی نہ ہو گی بلکہ توسیعِ نظام اور اصلاحِ معاشرہ کا مقصد بھی اس کے ساتھ خود بخود پورا ہو گا اور یہی آپ کا سیاسی کام بھی ہو گا۔ دوسری طرف جب آپ سیاسی کام کرنے اٹھیں گے تو یہ دوسری سیاسی پارٹیوں کے طرز پر محض سیاسی کام ہی نہ ہو گا، بلکہ اس کا افتتاح ہی دعوتِ دین سے لیا جائے گا، اور اس کے اندر لازماً توسیعِ نظام اور اصلاحِ معاشرہ کے عناصر بھی شامل ہونگے۔ مثال کے طور پر اُس انتخابی کام کو لیجیے جو ۱۹۵۱ء میں ہم نے کیا تھا۔ اس کے متعلق اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ صرف سیاسی

کام تھا تو یہ اس کی اپنی سمجھ کا قصور ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اُس انتخابی مہم میں دعوتِ دین پھیلانے کا کام جتنے وسیع پیمانے پر کیا گیا تھا اس کی کوئی دوسری مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔ اُس وقت جو منشور شائع کیا گیا تھا اسے پڑھ کر دیکھ لیجیے۔ اگر اس پر دعوت کا اطلاق نہ ہوتا ہو تو میں نہیں سمجھتا کہ پھر کس چیز پر اس نام کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اور اُس وقت جو تقریریں کی گئی تھیں ان کے مضامین پر بھی غور کر لیجیے۔ آخر ان میں سے کونسی تقریر دین کی بنیادی دعوت سے خالی تھی؟ اسی طرح اُس وقت انتخابی مہم کی بدولت نظامِ جماعت کی توسیع کا جو کام ہوا وہی تو آخر کار دُور دراز کے دیہاتی علاقوں تک میں مستقل حلقہ ہائے متفقین کی تنظیم کا ذریعہ بنا۔ پھر اصلاحِ معاشرہ کا اس سے بڑا کام اور کیا ہو سکتا ہے کہ اُس انتخابی مہم میں سابق پنجاب کی ڈیڑھ ہزار بستیوں کے پچاس ہزار باشندوں کو اس بنیاد پر منظم کر لیا گیا کہ وہ اسلامی نظام کے قیام کا مقصد سامنے رکھ کر اپنی نمائندگی کے لیے نیک آدمی تلاش کریں، اور کم از کم ڈیڑھ لاکھ آدمیوں کو اس بات پر آمادہ کر لیا گیا کہ حکومت کے دباؤ، زمینداروں کے دباؤ، برادری کے تعصب اور روپے کے لالچ سے آزاد ہو کر خالص اصول کی خاطر اچھے آدمیوں کے حق میں رائے دیں۔ معاملے کے اس پہلو کو نگاہ میں رکھا جائے تو ان لوگوں کی رائے اور بھی زیادہ کم وزن رہ جاتی ہے جو توازن و عدمِ توازن کے سوال پر لائحۂ عمل کی شکست و ریخت کا دروازہ مستقلاً کھلا رکھنا چاہتے ہیں۔

(باقی)

شاہراہ مکّہ

(آخری قسط)

مغربی تہذیب سے انسانیت کو جو عظیم نقصانات پہنچے ہیں، ان میں ایک شدید نقصان خاندانی نظام کی بربادی بھی ہے۔ اس نظام کے کمزور ہو جانے کی وجہ سے اب نہ تو والدین کو اپنی اولاد سے محبت رہی ہے اور نہ ہی، اولاد کو اپنے ماں باپ اور دوسرے اعزہ سے کوئی اُنس باقی رہا ہے۔ چونکہ اب زندگی کے ہر معاملہ کو جیب اور پیٹ کے نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے اس لیے زندگی کے وہ سارے تعلقات اور روابط جن کی بنیاد محبت، مودّت اور ایثار پر ہے، وہ قریب قریب ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ اب عزت و توقیر اسی شخص کی ہے جو مادّی اعتبار سے زیادہ خوشحال ہے۔ باپ اگر کماتا ہے تو وہ تعظیم کے لائق ہے لیکن اگر وہ کمانا چھوڑ دیتا ہے تو پھر وہ ایک بوجھ ہے اور یہ جتنی جلدی ہلکا ہو، اولاد کے حق میں اتنا ہی بہتر ہے۔ وہ اولاد جو والدین کو بار محسوس کرے، اس کا جو تعلق اپنے بزرگوں سے ہوگا اس کا ہر شخص خود ہی اندازہ کر سکتا ہے۔

اس کے برعکس جس تہذیب نے اپنی رفیع الشان عمارت مادّی بنیادوں پر نہیں بلکہ خالص روحانی بنیادوں پر تعمیر کی ہے۔ اس میں باہمی تعلقات کی نوعیت بالکل دوسری ہوتی ہے۔ یہاں کسی شخص کا عزت واحترام اس وجہ سے نہیں کیا جاتا ہے کہ وہ مادّی لحاظ سے ہمارے لیے فائدہ مند ہے بلکہ صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس سے ہمارا جذباتی اور روحانی رشتہ کس قسم کا ہے، اور اس سے ہماری روح کو کس طرح بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے اس تعلق کو احسان پر استوار کرنے کی ہدایت کی ہے۔ قرآن حکیم نے جہاں جہاں اس حق پر بحث کی ہے اس کا ذکر بھی ہے

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا — یاد کرو، اسرائیل کی اولاد سے ہم نے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ، عزیز و

وَذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا۔ (البقرہ - ۱۰)

اقارب کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا اور لوگوں سے بھلی بات کہنا۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا۔ (النساء - ۲)

اور تم سب اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ شریک نہ بناؤ، ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو، قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ اور پڑوسی رشتہ دار سے، اجنبی ہمسایہ سے، ہم نشین دوست سے، اور مسافر سے، اور اُن لونڈی غلاموں سے جو تمہارے قبضہ میں ہیں، احسان کرو۔ یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اپنے پندار میں مغرور اور اپنی بڑائی پر فخر کرے۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا (بنی اسرائیل - ۲)

تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اس کی۔ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس اُن میں سے کوئی ایک یا دونوں، بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں اُف نہ کہو نہ انہیں جھڑک کر جواب دو۔ بلکہ اُن سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو، اور دعا کرو کہ پروردگار ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔

یہ اور اسی قسم کی دوسری بے شمار آیات اس حقیقت کی غمازی کرتی ہیں کہ ایک مسلمان کا اپنے والدین اور دوسرے اقرباء سے تعلق خالص روحانی نوعیت کا ہے۔ اس کی تہ میں کوئی مادی حرص یا کوئی معاشی نفع کارفرما نہیں بلکہ اس میں جذبہ اور خلوص بطور اساس کے کام دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ ان آیات میں جو دوسری چیز قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ اسلام میں والدین کی خدمت اُن کی عزت و توقیر اور خویش و اقارب سے حسنِ سلوک اتنی بڑی اہمیت کے حامل ہیں کہ ان کا جب بھی ذکر کیا گیا ہے وہ شرک سے مخالفت کے بعد شروع ہوا ہے یعنی انسان اور خدا کے تعلقات میں سب سے

زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ وہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرے، اُس کی ذات و صفات میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے اور پھر انسان اور انسان کے تعلق میں جو چیز سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے وہ یہ کہ ایک شخص اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرے، خصوصاً اُن حالات میں جب کہ وہ بوڑھے ہو چکے ہوں اور کچھ کمانے کے قابل نہ ہوں۔ بڑھاپا زندگی کا وہ دور ہے جس میں ایک شخص عام طور پر دوسروں کے لیے بوجھ بنتا ہے، جس میں اُس کی طبیعت میں بچوں کی سی عادات پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ بچوں کی طرح ضد کرنے لگتا ہے، ذرا ذرا سی بات پر چڑ جاتا ہے۔ اُس کی قوتِ برداشت کم ہو جاتی ہے اور طبیعت پر غصہ غالب رہتا ہے یہی وہ زمانہ ہے جس میں وہ دوسروں کے حسنِ سلوک کا نسبتاً زیادہ محتاج ہوتا ہے اس لیے قرآن حکیم نے اس عہد کے لیے خصوصاً تاکید فرمائی ہے۔

ایک مغربی تہذیب میں سرشار انسان کے لیے یہ چیز بڑی حیرت انگیز ہے کہ کوئی شخص اپنے "ناکارہ" اور "غیر مفید" والدین کی خدمت کرے، اور اپنی ضروریات کو قربان کرکے، اپنے عزیز و اقارب کی ضروریات پوری کرنے کی کوشش کرے۔ مغرب کا اندازِ فکر تو انسان کی رہنمائی اُس طریق پر کرتا ہے جس سے سماج کو زیادہ سے زیادہ مادی نفع حاصل ہو۔ اولاد اور والدین کے پاکیزہ تعلقات اہلِ مغرب کے نزدیک محض اعتباری باتیں ہیں اور یہ سب "دورِ جاہلیت" کی یادگار ہیں۔ اب جدید روشنی میں انسان کو نہایت ہی "حقیقت پسندانہ" انداز پر سوچنا چاہیے۔ انسان کی حیثیت ایک جانور کی سی ہے۔ وہ جب چارہ کم کھائے اور کما کر زیادہ لائے تو اُسے اس دنیا میں رہنے کا حق حاصل ہے اور ہمارے لیے بھی اُس کے بقا کے لیے فکر مند ہونا اشد ضروری ہے لیکن جب اُس کے چارے کا پلڑا اُس کی آمدنی کے مقابلے میں جھک جائے تو پھر سماجی "فلاح و بہبود" کے لیے ناگزیر ہے کہ اُسے "قصاب" کے حوالے کر دیا جائے جو اس مہذب سوسائٹی کو اس ناگوار بوجھ سے نجات دلا دے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ میں ایک طبقہ اسی طرز پر سوچنے لگا ہے۔ بوڑھے والدین کی زندگیاں اتنی تلخ کر دی گئیں کہ انھوں نے خود اپنے ہاتھوں زندگی کی ٹمٹماتی شمع کو گل کر دیا۔ بعض "روشن خیال فرزندوں" نے بھی اس جوئے کو اتار پھینکنے کے لیے اسکیمیں بنانا شروع کیں۔ اور علانیہ اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا جانے لگا کہ اگر بوڑھے والدین کو

نہایت آرام و سکون کے ساتھ موت کی نیند سلا دیا جائے تو آخر اس میں کیا حرج ہے۔ اس طرح ایک طرف تو بوڑھے لوگ بڑھاپے کے عذاب اور تکلیفات سے بچ جائیں گے اور دوسری طرف سوسائٹی پر سے یہ ناجائز بوجھ اتر جائے گا۔" بوڑھے آدمیوں میں سے بعض نے حالات کے یہ تیور دیکھ کر خود ہی اپنے آپ کو سماج کے قدموں میں ڈال دیا۔ کسی نے کہا میری نعش کو مرنے کے بعد ہسپتال کو دے دینا، کسی نے اسے جانوروں کو کھلا دینے کی وصیت کی۔ الغرض اس معاملہ پر بڑی سنجیدگی سے غور ہونے لگا۔ ان میں سے بعض لوگ جو زیادہ جدید اور روشن خیال تھے انہوں نے ایک قدم اور بڑھایا اور کہا کہ جس طرح جانوروں کی ہڈیاں اور ان کا خون کھاد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، کیوں نہ انسان کے جسم کو بھی اس کام میں لایا جائے۔ جو شخص ساری عمر سماج کے لیے زندہ رہا ہے اسے مرنے کے بعد بھی سماج ہی کی خدمت کرنی چاہیے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرز فکر کو زیادہ قبول عام نصیب نہیں ہوا، یہ بات منطقی حد تک تو درست ہے اور مادی تہذیب کے مزاج سے بالکل ہم آہنگ ہے۔ لیکن انسان کے معاملے میں جذبات نے اس نظریہ کو پروان نہ چڑھنے دیا اور وہ اس کی ترقی میں رکاوٹ کا باعث بنے۔

اسد صاحب، جنہوں نے مغربی تہذیب و تمدن کی آغوش میں پرورش پائی ہے، انہیں یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ ایک بادشاہ، جس کی عمر پچاس کے قریب ہے، اور جس نے خود اپنی محنت اور ذہانت سے سلطنت حاصل کی ہو وہ باپ کا اس قدر تابع فرمان ہو کہ وہ اس بالائی منزل پر بیٹھنا تک پسند نہ کرے جس کے نیچے اس کا باپ رہتا ہے۔ اپنے اس استعجاب کو انھوں نے مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

"شاہ ابن سعود اپنے باپ سے اس قدر زیادہ محبت کرتے تھے جس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ ان کے والد عبدالرحمن اگرچہ ایک پرہیزگار اور شفیق انسان تھے، لیکن اپنے بیٹے کی طرح کسی نمایاں خصوصیت کے حامل نہ تھے۔ اس دور کے بعد بھی جبکہ انھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کے ساتھ سلطنت حاصل کی تھی، وہ اپنے باپ سے یہاں تک ادب سے پیش آتے کہ جب

عبدالرحمن، اُن کے والد، کسی کمرے میں ہوتے تو وہ اُس کی چھت پر قدم تک رکھنا گوارا نہ کرتے۔ اور کہتے کہ میں اپنے والد محترم کے سر پر چلنے کی کس طرح جرأت کر سکتا ہوں۔ مجھے ان کی باپ کے سامنے اسی انکساری نے ایک مرتبہ ایک عجیب و غریب مخمصے میں ڈال دیا۔ میں ایک دن حسب معمول بادشاہ کے والد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ہم دونوں فرش پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ملازم نے آکر اطلاع دی کہ شیخ تشریف لا رہے ہیں۔ کچھ لمحات کے بعد بادشاہ دروازہ پر آپہنچا۔ میں نے تعظیم کی غرض سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن عبدالرحمن نے مجھے کلائی سے پکڑ کر بٹھا دیا اور کہا آپ میرے مہمان ہیں۔ میں اس بات سے سخت پریشان ہوا کہ بادشاہ تو اجازت کے انتظار میں باہر کھڑے رہیں اور میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہوں۔ اس اثنا میں عبدالرحمن نے اپنی گفتگو اس اطمینان سے جاری رکھی جیسے کہ کوئی دخل اندازی نہیں ہوئی۔ چند منٹوں کے بعد بادشاہ کے والد نے سر اٹھایا اور کہا "اے لڑکے نزدیک آکر بیٹھ جاؤ۔ اس وقت بادشاہ کی عمر سینتالیس سال کی تھی"۔

اس باب میں فاضل مصنف نے ایک بڑی فکر انگیز بحث یہ بھی چھیڑی ہے کہ ہم کسی شخص کو جب پہلے پہل اپنے آگے لگاتے ہیں تو اس مفروضہ پر اُس کی پیروی کرنا شروع کرتے ہیں کہ وہ شخص منزہ عن الخطا ہے، دنیا کے ہر عیب سے خالی ہے اور دنیا کی ہر صفت سے متصف ہے۔ لیکن جب اس میں ذرا سی خامی بھی دیکھ پاتے ہیں تو پھر اس کے خلاف جدوجہد کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں، اور اس وقت تک چین سے بیٹھنا پسند نہیں کرتے جب تک کہ اُس کے سب کیے کرائے پر پانی نہ پھیر دیا جائے۔ ہماری یہ کیفیت انتہائی افسوسناک ہے۔ ہم میں اعتدال نہیں۔ ہمارے فیصلے حقیقت پسندی پر مبنی نہیں ہوتے۔ اس معاملہ میں ہم ہمیشہ سے انتہا پسند واقع ہوئے ہیں۔ ہماری عقیدت و نفرت دونوں ہی اندھی ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری کوئی تحریک بھی کامیاب نہیں ہوتی۔ ہمارے نزدیک افضل و اکمل اگر کوئی ذات ہے تو وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ وہ ہر خطا سے پاک اور کمزوری سے منزہ ہیں۔ وہی ہمارے سامنے اصل معیار ہیں، وہی ہمارے لیے ایک آئیڈیل ہیں۔ ہر دوسرا شخص جو کچھ بھی کہے یا کرے، اسے ہمیں اسی ایک معیار سے مطابق جانچنا اور پرکھنا چاہیے اور اس نسبت

سے وہ جس مرتبہ میں ہو، اسے اسی مرتبہ اور مقام پر رکھنا چاہیے لیکن تاریخ کے ہر دور میں ہم نے اس بڑی حقیقت کو جو ہمارے ایمان کا ایک ضروری جزو ہے، بھلا دینے کی حماقت کی ہے اور اسی وجہ سے ہم مختلف قسم کی گمراہیوں میں مبتلا ہوئے ہیں۔ قریب قریب یہی سلوک اہلِ نجد نے شاہ ابن سعود سے کیا۔ اس نے جب شریف حسین کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تو لوگوں نے اُسے انسانیت کا واحد نجات دہندہ خیال کیا۔ لیکن جب اُس نے سلطنت حاصل کر چکنے کے بعد عیش و تنعم کی زندگی بسر کرنا شروع کی تو پھر اُسے فرعون کا لقب دیا گیا۔ اُس کے متعلق جس طرح پہلی رائے مبالغہ آمیز ہے اُسی طرح دوسری میں بھی غلو اور شدّت ہے۔

مسلمانوں کی قومی تاریخ میں کتنی شخصیتیں اُبھریں، انہوں نے عوام کے قلوب کو مسخّر کر کے بڑی بڑی زوردار تحریکیں چلائیں لیکن جلد ہی وہ ختم بھی ہو گئیں۔ جس مبالغہ آمیزانہ عقیدت نے انہیں جنم دیا۔ وہی پھر اُن کی مدفن بھی بنی۔ جس طرح کسی فرد یا تحریک میں ذرا سی خوبی ہمیں فوراً اس پر فریفتہ کر دیتی ہے اور ہم دل و جان سے اس پر فدا ہونے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، بالکل اسی طرح اُس میں ذرا سی لغزش یا کمزوری بھی ہمیں نفرت کی آخری انتہا تک لے جاتی ہے۔ اس اندازِ فکر سے ہماری ملت کو بے حد صدمہ پہنچا ہے۔

اس سلسلہ میں دوسری چیز یہ ہے ہم نے تحریکِ اسلامی کو ہمیشہ شعوری یا غیر شعوری طور پر افراد سے وابستہ کیا ہے۔ کسی تحریک کے اٹھانے اور اُسے لے کر آگے بڑھنے میں اشخاص کا بلاشبہ بڑا دخل ہے لیکن وہ تحریکات جو اصولوں پر قائم ہوتی ہیں ان میں اشخاص خواہ کتنی بڑی اہمیت کے حامل ہوں بہر حال ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہیں اصولوں پر کبھی بھی برتری اور تفوق نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن اسے اس قوم کی بدقسمتی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اصولوں سے محبت کی بجائے ہمیشہ افراد کو اپنا محورِ عقیدت بنایا ہے۔ اور اس میں اتنی زیادتی کی کہ اصولوں کو بڑی بے تکلفی کے ساتھ اشخاص کی بھینٹ چڑھا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ تحریکِ اسلامی کے

دھارے میں اگرچہ تسلسل اور روانی تو موجود ہے لیکن اس کی موجوں میں وہ یکسانیت دکھائی نہیں دیتی جس کا اس کی فطرت تقاضا کرتی ہے۔ ہمارے ہاں جب بھی کوئی تحریک احیائے اسلام کے لیے اٹھی تو وہ چند افراد کی ہر دلعزیزی پر اٹھی، لوگوں کو بھی محبت تحریک سے کہیں زیادہ افراد سے پیدا ہوئی اور جب ان افراد میں کوئی کمزوری دکھائی دی تو فوراً دل شکستہ ہو کر بیٹھ گئے۔ یہ طرزِ عمل اس حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے کہ ان حضرات کا تعلق صرف چند افراد سے تھا، اور انہیں کی وجہ سے وہ تحریک سے وابستہ تھے۔

مسلم قوم کی اس ذہنی کیفیت کو اسد صاحب نے ایک دوست کی زبان سے بڑی عمدگی سے ادا کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"ابن سعود نے اُن بہت سی توقعات کو جو جوانی میں اس سے وابستہ کی جاتی تھیں، اپنے طرزِ عمل سے غلط ثابت کیا ہے۔۔۔۔ لوگ کس طرح آسانی کے ساتھ اُس نا امیدی کو برداشت کر سکتے ہیں، جو انہیں اس سے ہوئی ہے یہی وجہ ہے کہ نجد کے اب بہت سے نوجوان شاہ کے خلاف نہایت تلخ باتیں کہتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ بادشاہ نے اُن کے اعتماد کو نقصان پہنچایا ہے۔ میں اپنے ایک نجدی دوست کے یاس قنوطیت کے اُن جذبات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا جو کبھی ابن سعود کی قیادت کا پر جوش حامی تھا اور جس نے زندگی کے تاریک ترین لمحات میں اُس کا ساتھ دیا۔ اُس نے شاہ کے متعلق ایک دفعہ گفتگو کرتے ہوئے کہا۔

"جب ہم ابن سعود کے جھنڈے تلے ۔۔۔۔ وہ جھنڈا جس پر کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا ۔۔۔ شریف حسین کی مخالفت میں آگے بڑھ رہے تھے تو ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ ابن سعود وہ موسیٰ ہے جو ہمیں جہالت اور تباہی کی تاریک وادیوں سے نکال کر اسلام کی آزاد اور امن پسندانہ سرزمین میں لے جائے گا۔ لیکن اُس نے جب آرام و آسائش میں کھو کر اپنی رعایا اور اُس کے مستقبل کو فراموش کر دیا تو پھر ہمارے نزدیک اُس کی حیثیت ایک فرعون کی سی تھی۔"

اُس کے اس تاثر پر اسد صاحب تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"میرے رفیق نے ابن سعود کے خلاف جس غیظ و غضب کا اظہار کیا ہے اُس میں بڑی تلخی ہے

اور اس کی رائے غیر محتاط اور غیر منصفانہ ہے۔ شاہ نہ تو فرعون ہے اور نہ ہی ظالم۔ وہ ایک شفیق انسان ہے اور اپنی رعایا سے محبت کرتا ہے۔ لیکن وہ موسیٰ بھی نہیں۔ اس کی ناکامی کی اصلی وجہ یہ ہے کہ وہ اس ارفع اور اعلیٰ معیار پر پہنچ نہ سکا جس پر لوگ اسے دیکھنے کے آرزومند تھے۔ . . . وہ زیادہ سے زیادہ ایک وسیع پیمانے پر رحم دل قبائلی سردار ہے۔"

اس کے بعد فاضل مصنف نے ایران کے ذہنی پس منظر کا جائزہ لے کر یہ بتایا ہے کہ یہاں شیعیت کو کیوں زیادہ عروج ہوا۔ وہ فرماتے ہیں۔

"تقریباً ڈیڑھ سال جو میں ایران میں رہا میں نے محسوس کیا کہ اس ملک میں یاس و قنوطیت چھائی ہوئی ہے اور یہ چیز دیہات اور شہروں میں، لوگوں کے باہمی تعلقات میں، حتیٰ کہ ان کے مذہبی تہواروں میں ـــ الغرض ہر جگہ نمایاں ہے۔ ایرانیوں کے مذہبی احساسات میں عربوں کے برعکس غم و افسوس کا عنصر غالب ہے۔ ان کے نزدیک حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ان کے نامور بیٹوں حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کی وفات پر آہ و فغاں کرنا اس سے کہیں زیادہ اہم ہے کہ وہ دیکھیں کہ اسلام ہم سے کس چیز کا مطالبہ کرتا ہے اور ہمارے سیرت و کردار کو کس سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے۔"

اسد صاحب نے دجال کے ذیل میں بحث کرتے ہوئے مغربی تہذیب پر بڑی سخت چوٹیں کی ہیں۔ یہ ساری بحث بڑی ہی دلچسپ ہے۔ اس کے کچھ حصے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

"تہذیب جدید دجال کی طرح کانی اور یک رخی ہے۔ وہ صرف انسان کے ایک پہلو یعنی مادی ترقی کی طرف دیکھتی ہے اور اس کے روحانی پہلو کو بالکل نظر انداز کرتی ہے۔ اس نے اپنے صنعتی کمالات کی وجہ سے انسانوں کو ان کی طبعی استعداد سے کہیں زیادہ بڑھ کر دیکھنے اور سننے کے قابل بنا دیا ہے، وہ اب زیادہ سے زیادہ فاصلے تھوڑے سے تھوڑے عرصے میں طے کر سکتے ہیں. . . . اس کی مادی ترقی نظر کو اس قدر خیرہ کرنے والی ہے کہ جن لوگوں کا ایمان کمزور ہے انھوں نے اسی کو خدا تسلیم کر لیا ہے۔"

"انہیں اس امر کا پورا یقین ہے کہ یہ تہذیب انہیں راحت اور حقیقت سے ہم کنار کردے گی اٹھارویں اور انیسویں صدی میں انھوں نے دنیا کے اطراف و اکناف میں عیسائیت کو پھیلانے کے منصوبے بنائے لیکن اب اُن کا مذہبی جوش اور ولولہ اتنا سرد پڑ گیا ہے کہ اس کی حیثیت پس پردہ سازکی سی ہے، جو ہمیشہ بجتا تو رہتا ہے لیکن ان کی زندگی کو متاثر نہیں کرتا۔ ان لوگوں نے اب زندگی کے مادی نظریہ کی اشاعت شروع کی ہے ۔ اُن کا عقیدہ اب یہ ہے کہ دنیا کے سارے مسائل کارخانوں، تجربہ گاہوں، ماہرینِ شماریات کی میزوں پر حل کیے جا سکتے ہیں۔"

"مغربی انسان نے حقیقت میں دجال کی پرستش شروع کردی ہے۔ عرصہ ہوا وہ شرافت کو چھوڑ بیٹھا ہے۔ اُس کا اب فطرت سے بھی تعلق باقی نہیں رہا۔ زندگی اس کے لیے ایک معمہ ہے۔ وہ شک کی بیماری میں مبتلا ہے۔ وہ اپنے عزیز و اقارب حتیٰ کہ اپنے آپ سے بیگانہ ہے۔ اپنی اس تنہائی کو دُور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ زندگی کو خارجی ذرائع سے مفتوح کرے۔ اُس کا محض زندہ رہنا اُسے اندرونی طور پر اطمینان اور تسکین عطا نہیں کرسکتا۔ چونکہ اُس کا اپنے خدا سے رشتہ منقطع ہو گیا ہے اس لیے اُس نے اپنی رفاقت کے لیے مشین کو منتخب کیا ہے وہ اب اپنی ساری توجہ اسی پر صرف کررہا ہے لیکن اس نے اس کے لیے نئی ضروریات اور نئے خطرات پیدا کردیئے ہیں۔ مشین کا پہیہ اب اس کا خدا ہے۔ لیکن اس کے مذہب کے پروہت اور پادری غالباً اس حقیقت سے واقف نہیں کہ یہ حیرت انگیز صنعتی ترقی علم کے اضافہ اور وسعت کا نتیجہ نہیں بلکہ روحانی ناکامی اور مایوسی کا اثر ہے اور یہ حیرت انگیز مادی کمالات جن کی موجودگی میں انسان یہ گمان کر بیٹھا ہے کہ وہ فطرت کو مسخر کرنے کا در حقیقت ایک مایوس انداز فکر کے ترجمان ہیں ... اس کے چمکتے ہوئے "ظاہر" کے پیچھے ... کے وجود کا احساس انگڑائیاں لے رہا ہے۔"

کتاب کے مصنف بسا اوقات جذبات کی رو میں بہہ کر بڑے جوش سے سوالات کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کی پستی اور بدحالی پر سخت مضطرب اور پریشان ہیں۔ وہ اس بات پر حیران ہیں کہ اس

قوم نے آخر اسلام ایسی متاع گراں مایہ کو کیوں چھوڑ دیا ہے۔ وہ جب اس موضوع پر آتے ہیں تو جھنجلا اٹھتے ہیں۔ اُن کی اس جھنجلاہٹ کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیں۔

"اے مسلمانو! آخر اس کا سبب کیا ہے کہ تمہارا اپنے آپ سے اعتماد اٹھ گیا ہے، وہ اعتماد جس کی مدد سے تم نے کبھی عرب سے مغرب کی طرف بحر اوقیانوس تک اور مشرق میں چین تک کا علاقہ ایک صدی کے اندر اندر ہی فتح کر لیا۔ اور اب تم شکست خوردہ ذہنیت کے ساتھ مغربی رسم و رواج کو بڑی آسانی سے قبول کرتے جا رہے ہو۔ تم وہ لوگ ہو جن کے آبا و اجداد نے عقل اور علم کو چار چاند لگائے، تہذیب کے گیسو سنوارے۔ تم کیوں اپنے درخشاں ماضی کی طرف نہیں پلٹتے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ ادنیٰ سا فوجی اتاترک جو اسلام کی ساری اقدار کا انکار کرتا ہے وہ تمہارے لیے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا ایک نشان بن چکا ہے۔ تم مجھے بتاؤ کہ کس طرح تمہارے پیغمبر کی سادہ تعلیمات بے مقصد قیاس آرائیوں اور بحث و مناظرہ میں دب کر رہ گئی ہیں۔ تمہارے شہزادے اور تمہارے جاگیردار عیش و عشرت کی زندگی ان حالات میں بسر کر رہے ہیں جبکہ اُن کے لاتعداد بھائی انتہائی غربت اور افلاس میں مبتلا ہیں۔"

"تمہارے اسلام نے ایک ایسی تہذیب کو جنم دیا جس میں نہ تو نیشنلزم ہے اور نہ ہی طبقہ واریت۔ اس میں نہ تو کوئی چرچ ہے اور نہ ہی کوئی مذہبی گروہ۔ اس میں شرافت ایک نسل سے دوسری نسل سے منتقل نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک فرد کے اعمال پر موقوف ہے۔ اس تہذیب کا مقصد انسان اور خدا کے درمیان تھیاکریسی کا قیام تھا، اور انسانوں میں جمہوریت کا نشوونما۔"

اسد صاحب کا جوش جب کچھ دیر کے بعد ٹھنڈا ہوتا ہے تو وہ پھر اسلام کے متعلق نہایت ہی صحیح نتیجے پر خود بخود پہنچ جاتے ہیں۔

"مسلم ممالک میں مسلمانوں کے جو حالات میں نے دیکھے، انھوں نے مجھے اسلام سے کسی طرح بھی بدظن نہ کیا۔ چار سال جو میں نے وہاں گزارے، اُن میں میں اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہو گیا کہ اسلام اب بھی ایک زندہ و پائندہ قوت ہے۔ میرے لیے صرف اسی قدر جاننا باعث اطمینان تھا

(باقی صفحہ ۲۸ پر)

رسائل و مسائل

صحابہ کرام بعض اختلافات کے باوجود رُحَمَآءُ بَیْنَہُمْ تھے

سوال۔ کچھ عرصہ قبل فضائلِ صحابہ کے موضوع پر اظہارِ خیال کا موقع ملا، میں نے حسبِ توفیق مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ کی تشریح کی۔ بعد میں ایک صاحب نے سوال کیا کہ قرآن شریف تو صحابہؓ کی یہ صفت بیان کر رہا ہے لیکن واقعات کی تصویر اس کے برعکس ہے۔ جنگِ جمل و صفین میں دونوں طرف اکابر صحابہ موجود تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ بھی ایک فریق کے ہمراہ تھیں۔ ان واقعات کی روشنی میں رُحَمَآءُ بَیْنَہُمْ کی صحیح توجیہ کیا ہو سکتی ہے؟ میں نے حتی الوسع اس معاملے پر غور کیا، بعض کتبِ دینیہ اور ذی علم احباب سے بھی رجوع کیا مگر کچھ اطمینان نہ ہو سکا۔ آپ براہِ کرم ان واقعات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ارشادِ قرآنی کی صحیح تاویل و توجیہ بیان کریں جس سے یہ اشکال رفع ہو جائے۔

جواب۔ آپ کے عنایت نامے کا جواب افسوس ہے کہ بڑی تاخیر سے دے رہا ہوں۔ اس مہینے شدید مصروفیت رہی اس لیے خطوط پڑھنے تک کا وقت نہ ملا، جواب دینا تو درکنار۔ امید ہے کہ میری مشکلات کو نگاہ میں رکھ کر اس تاخیر سے درگزر فرمائیں گے۔

آیت اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَہُمْ پر جس شبہ کا اظہار محترم سائل نے کیا ہے وہ دو مفروضوں پر مبنی ہے، اور دونوں ہی خلافِ حقیقت ہیں۔ ان کا پہلا مفروضہ یہ ہے کہ کسی شخص یا گروہ کی تعریف میں جب کوئی بات کہی جائے تو لازماً اسے ان معنی میں لینا چاہیے کہ اس شخص یا اس گروہ میں کبھی کوئی جزئی امر بھی اس کے خلاف نہ پایا جائے۔ حالانکہ انسانوں کی تعریف جب بھی کی جاتی ہے ان کے غالب حال کے لحاظ سے کی جاتی ہے، اور کبھی کبھار کوئی چیز اس کے خلاف نظر آئے تو وہ کلی حکم میں قادح نہیں سمجھی جاتی۔ ہم صحابہ کرام

کو دنیا کا سب سے زیادہ اتقیٰ اور اصلح گروہ قرار دیتے ہیں۔ یہ حکم ان کی مجموعی سیرت کے لحاظ سے ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس گروہ میں کبھی بشریت کے تقاضوں سے جزئی مزوریوں کا صدور سرے سے ظہور ہی نہیں ہوتا تھا۔ آخر اس زمانہ میں بھی کسی کو زنا اور کسی کو چوری کی سزا، اور کسی کو قذف کی سزا دی ہی گئی تھی، اور صحابیت کا شرف ان سزا یافتہ لوگوں کو بھی حاصل تھا، کیونکہ ایمان کے بعد جس شخص کو حضورؐ کی صحبت میسر ہوئی ہو وہ بہرحال صحابی ہے، اور ان قصوروں کی بنا پر بہرحال نہ صفت ایمان ان سے سلب ہوئی تھی نہ صفت صحابیت۔ مگر کیا یہ بات کہ کبھی اس معاشرے میں زنا اور چوری اور قذف کے گناہوں کا صدور بھی ہو گیا تھا اس مجموعی حکم میں قادح ہو سکتی ہے کہ وہ معاشرہ صلاح و تقویٰ میں اس بلند ترین مرتبے پر پہنچا ہوا تھا جس پر کبھی کوئی انسانی معاشرہ نہیں پہنچا؟ اسی طرح رحماء بینہم کی صفت صحابۂ کرام کی مجموعی سیرت اور ان کے غالب حال کے لحاظ سے ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ کسی انسانی معاشرے میں آپس کی محبت والفت، باہمی ہمدردی و خیر اندیشی، اور ایک دوسرے کے حقوق کا لحاظ اور مرتبے کا احترام اس درجے کا نہیں پایا جاتا اور نہ پایا گیا ہے جیسا صحابۂ کرام کے معاشرے میں نظر آتا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان کے اندر یہ صفت انتہائی ممکن کمال تک پہنچی ہوئی نظر آتی ہے جس کا کسی انسانی معاشرے کے حق میں تصور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن انسان بہرحال انسان ہیں، ان کے اندر بہرحال کبھی نہ کبھی اختلافات بھی پیدا ہو سکتے ہیں اور وہ اختلافات لڑائی جھگڑے کی صورت بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ صحابۂ کرام بھی انسان ہی تھے۔ عالم بالا سے کوئی فوق البشر مخلوق حضورؐ کی صحبت و معیت کے لیے اتر کر نہیں آئی تھی۔ ایک دوسرے کے ساتھ رہن سہن، لین دین، اور اجتماعی زندگی کے معاملات کرتے ہوئے لامحالہ بتقاضائے بشریت ان میں اختلافات بھی ہو جاتے تھے، اور بعض اوقات یہ اختلافات شدید نوعیت بھی اختیار کر گئے ہیں۔ لیکن ان جزئی واقعات سے اس کلی حکم میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ ان کی امتیازی صفت رحماء بینہم تھی، کیونکہ ان کا غالب حال یہی تھا۔

دوسرا مفروضہ جو ان کے اس شبہ کے پیچھے کام کر رہا ہے، یہ ہے کہ صحابۂ کرام میں کبھی جو اختلافات رونما ہوئے ہیں وہ اس نوعیت کے تھے کہ ان سے رحماء بینہم کی صفت بالکل ہی سلب ہو گئی تھی حالانکہ

ان اختلافات کی جو تاریخ ہم تک پہنچی ہے وہ اس بات پر گواہ ہے کہ یہ مقدس انسان جب آپس میں لڑ بھی جاتے تھے تو ان کی اس لڑائی میں بھی رحماء بینہم ہونے کی ایک انوکھی شان پائی جاتی تھی بے شک وہ جنگ جمل و صفین میں ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہوئے ہیں، مگر کیا دنیا کی کسی خانہ جنگی میں آپ فریقین کو ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے ہوئے بھی ایک دوسرے کا وہ احترام ملحوظ رکھتے دیکھتے ہیں جو ان بزرگوں کی لڑائی میں نظر آتا ہے۔ وہ نیک نیتی کے ساتھ اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہوئے لڑے تھے نفسانی عداوتوں اور اغراض کی خاطر نہیں لڑے تھے۔ انہیں افسوس تھا کہ دوسرا فریق ان کی پوزیشن غلط سمجھ رہا ہے اور خود غلط پوزیشن اختیار کرتے ہوئے بھی اپنی غلطی محسوس نہیں کر رہا ہے۔ وہ ایک دوسرے کو فنا کر دینے پر تلے ہوئے نہیں تھے بلکہ اپنی دانست میں دوسرے فریق کو راستی پر لانا چاہتے تھے۔ ان میں سے کسی نے کسی کے ایمان سے انکار نہیں کیا، اس کے اسلامی حقوق سے انکار نہیں کیا، بلکہ اس کی فضیلت اور اس کی اسلامی خدمات کا انکار بھی نہیں کیا۔ انھوں نے ایک دوسرے کو ذلیل و رسوا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ لڑنے میں انہوں نے لڑائی کا حق ضرور ادا کیا، مگر لڑ کر گر جانے والے کے لیے وہ سراپا رحم و شفقت تھے اور گرفتار ہو جانے والے پر مقدمہ چلانا اور اس کو سزا دینا یا اس کو ذلیل و خوار کرنا تو درکنار، تیر و تلوار کسی مدعے میں بھی نشانۂ عتاب بنانا تک انہوں نے گوارا نہ کیا۔ ذرا دیکھیے، عین اس وقت پر جب جنگ جمل برپا ہے دونوں فوجیں آمنے سامنے کھڑی ہوئی ہیں، حضرت علیؓ حضرت زبیرؓ کو پکارتے ہیں اور وہ ان سے ملنے کے لیے نکل آتے ہیں۔ دونوں میں سے کسی کو بھی دوسرے سے یہ اندیشہ نہیں ہوتا کہ وہ اس پر اچانک حملہ کر دیگا۔ صفوں کے درمیان دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر روتے ہیں۔ دونوں طرف کی فوجیں یہ دیکھ کر حیران رہ جاتی ہیں کہ یہ ایک دوسرے سے لڑنے آئے تھے اور گلے مل کر رو رہے ہیں۔ دونوں تنہائی میں بات کر کے اپنی اپنی فوجوں کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔ حضرت علیؓ کی فوج والے ان سے پوچھتے ہیں کہ امیر المومنین آپ عین لڑائی کے موقع پر ننگے سر ایک شخص سے تنہا ملنے چلے گئے؟ جواب میں فرماتے ہیں، جانتے ہو وہ شخص کون تھا؟ وہ صفیہ عمۂ رسول اللہ کا بیٹا تھا۔ میں نے اس کو رسول اللہ کی ایک بات یاد دلائی۔ اس نے کہا کاش یہ بات مجھے پہلے یاد آ جاتی تو میں آپ کے مقابلے میں لڑنے نہ آتا۔ لوگ اس پر کہتے ہیں الحمد للہ،

اے امیر المومنین، یہ رسول اللہ کے شہسوار اور حواری ہیں، ہم کو انہی کا سب سے زیادہ خوف تھا۔ دوسری طرف حضرت زبیرؓ پلٹ کر اپنی فوج میں جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شرک و اسلام میں جب کبھی بھی کسی لڑائی میں شریک ہوا ہوں، مجھے اس میں بصیرت حاصل تھی، مگر اس لڑائی میں نہ میری رائے ہے، نہ یقین ہے نہ بصیرت۔ اور یہ کہہ کر وہ فوج سے نکل جاتے ہیں۔ اسی طرح حضرت علیؓ اور حضرت طلحہؓ کی بھی دونوں صفوں کے درمیان تنہا ملاقات ہوتی ہے، اور دونوں ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لڑائی شروع ہوتی ہے تو حضرت علیؓ اپنی فوج میں اعلان کرتے ہیں کہ خبردار کسی کا تعاقب کرکے نہ مارنا، کسی زخمی پر ہاتھ نہ اٹھانا۔ ان کے لشکر کا مال تم لے سکتے ہو مگر ان شہداء کے گھروں پر ان کے جو مال ہیں وہ ان کے وارثوں کا حق ہے، اور ان کی عورتوں کے لیے عدت ہے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ جب ان کے لشکر کے مال ہمارے لیے حلال ہیں تو ان کی عورتیں کیوں نہ حلال ہوں؟ حضرت علیؓ بگڑ کر فرماتے ہیں کہ تم میں سے کون اپنی ماں عائشہؓ کو اپنے حصے میں لینے کے لیے تیار ہے؟ لوگ پکار اٹھتے ہیں: نستغفر اللہ۔ جنگ کے بعد مقتولوں پر سے حضرت علیؓ کا گزر ہوتا ہے۔ حضرت طلحہؓ کے بیٹے محمد کی لاش پر نظر پڑتی ہے تو بے اختیار فرماتے ہیں: رحمک اللہ یا محمد، لقد کنت فی العبادۃ مجتہدا، بالاسحار قواما و فی الحرور صواما "خدا کی رحمت ہو تم پر اے محمد، تم بڑے عبادت گزار، راتوں کو کھڑے رہنے والے اور سخت گرمیوں میں روزے رکھنے والے تھے"۔ حضرت زبیرؓ کا قاتل انعام کی امید پر حاضر ہوتا ہے تو اس کو دوزخ کی بشارت دیتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ کے ہودے کے پاس پہنچتے ہیں تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہتے کہ "اے ہودے والی، اللہ نے آپ کو گھر میں بیٹھنے کا حکم دیا تھا اور آپ لڑنے نکل آئیں"۔ پھر بڑے احترام کے ساتھ ان کو مدینہ روانہ کر دیتے ہیں، اور وہ اس حسن سلوک پر ان کو دعا دیتی ہیں کہ جزی اللہ ابن ابی طالب الجنۃ۔

حضرت طلحہؓ کے بیٹے موسیٰ حضرت علیؓ سے ملنے آتے ہیں تو آپ انہیں بٹھا کر فرماتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ میں اور تمہارے باپ ان لوگوں میں سے ہوں گے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "ہم ان کے دلوں سے باہمی کدورت نکال دیں گے اور وہ جنت میں بھائی بھائی کی حیثیت سے آمنے سامنے چھپر کھٹوں پر بیٹھیں گے" ایک شخص پوچھتا ہے آپ کے پاس یہ کون آیا تھا؟ فرماتے ہیں یہ میرا بھتیجا تھا۔ وہ عرض کرتا ہے کہ اگر یہ

آپ کا اب بھی بھتیجا ہے تو ہم تو پھر بد بخت ہی ہوئے۔ اس پر ناراض ہو کر حضرت علیؓ فرماتے ہیں ویحک: ان اللہ قد اطلع علی اھل بدر فقال اعملوا ما شئتم فقد غفرت لکم۔ دیکھیے، یہ شان تھی ان لوگوں کی آپس کی لڑائی کی۔ وہ تلوار بھی ایک دوسرے پر اٹھا کر رُحَمَاءُ بَیْنَھُم ہی رہتے تھے۔ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی قدر، عزت، محبت، اسلامی حقوق کی مراعات، اس شدید خانہ جنگی کی حالت میں بھی جوں کی توں برقرار رہی۔ اس میں یک سرِ مُو فرق نہ آیا۔ بعد کے لوگ بسِّ کے حامی بن کر ان میں سے کسی کو گالیاں دیں تو یہ ان کی اپنی بدتمیزی ہے، مگر وہ لوگ آپس کی عداوت میں نہیں لڑے تھے اور لڑ کر بھی ایک دوسرے کے دشمن نہ ہوئے تھے۔

کیا مشرکین کے بچے جنت میں جائیں گے؟

سوال: میں ایک ۱۸ سالہ سندھی نوجوان ہوں۔ اس وقت میٹرک میں ہوتے ہوئے ایک عربی مدرسے میں دو سال سے دینی تعلیم بھی حاصل کر رہا ہوں۔ ہمارے ہاں عربی تعلیم کا نظام کچھ اس طرز کا ہے کہ ابتدا ہی میں میرے اندر اس تعلیم سے نفرت اور بیزاری پیدا ہو گئی اور ایک سال کے اندر اندر اسی عربی تعلیم نے مجھے "لامذہب" بنا کے رکھ دیا۔ لیکن چونکہ میرے اندر صراطِ مستقیم پانے کی دلی تمنا تھی اس لیے میں ہمیشہ بارگاہِ الٰہی کے حضور میں دعا کرتا رہا کہ وہ مجھے "راہِ راست" پر لے آئے۔ اللہ تعالیٰ نے انتہائی کرم فرمائی کی کہ مجھے ایمان ایسی دولت پھر سے عطا ہوئی چنانچہ میں اب اُسی کے فضل و کرم سے دل و جان سے مسلمان ہوں، قومیت سے سخت متنفر اور نظریۂ انسانیت کا پیرو۔ اس ایک سال کے عرصہ میں میں نے "مسند و منبر" دونوں کو دیکھا لیکن کہیں سے اطمینانِ قلبی نصیب نہیں ہوا۔ اور اگر کہیں سے یہ نعمت میسر آئی تو پھر اُسی کتابِ الٰہی کے مطالعہ سے جسے لوگ قرآن حکیم کہتے ہیں۔

یوں تو اب میں اسلام کو اپنا دین مان چکا ہوں لیکن پھر بھی مطالعہ کے دوران میں بعض احادیث اور فقہی مسائل ایسے آتے ہیں جو بسا اوقات مجھے پریشان کرتے ہیں۔ آج ہی کی بات ہے کہ مدرسہ

میں مشکوٰۃ کا درس ہو رہا تھا جب اس حدیث پر پہنچا جو باب الایمان بالقدر میں ہے کہ عن ابن مسعودؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الوائدۃ والموؤدۃ فی النار (لڑکی کو زندہ گاڑنے والی اور وہ لڑکی جو زندہ گاڑی گئی، دونوں جہنم میں جائیں گی)۔ تو میں نے استاد مکرم سے صرف یہ کہا کہ حضور یہ حدیث میری سمجھ میں نہیں آتی۔ انھوں نے جواب دیا کہ تمھاری سمجھ سے ہی کیا کہ تم اسے سمجھ سکو، تمہیں تو بس آمنّا وصدّقنا ہی کہنا چاہیے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ صحیح ہے کہ میری سمجھ ناقص ہے لیکن میں اتنا تو سمجھ سکتا ہوں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک سے ایسے ناانصافی کے الفاظ نہیں نکل سکتے۔ اگر آپؐ نے یہ حدیث فرمائی ہے تو اس کا مفہوم یہ نہیں ہو سکتا جو کہ بظاہر ترجمہ سے معلوم ہوتا ہے، اور اگر اس کا مفہوم یہی ہے تو پھر یہ حدیث حضور سرورِ کائنات کی نہیں ہو سکتی۔ میرے یہ الفاظ کہنے تھے کہ میرے لیے مصیبت پیدا ہو گئی۔ مجھے محض اس وجہ سے مدرسے سے خارج کر دیا گیا اور کہا گیا کہ تم منکرِ حدیث ہو۔ حالانکہ میں منکرینِ حدیث کے مسلک کو صحیح نہیں سمجھتا اور اسے گمراہ کن خیال کرتا ہوں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہمیں احادیث کو سمجھنے کا حق بھی پہنچتا ہے یا نہیں۔ ہم بلا سوچے سمجھے کس طرح اس قسم کی احادیث پر آمنّا وصدّقنا کہنا شروع کر دیں حالانکہ بعض محدثین نے اس کی اسناد کو بھی ضعیف قرار دیا ہے۔ براہِ کرم اس حدیث کی وضاحت فرما کر میری رہنمائی فرمائیں۔

جواب: یہ معلوم کر کے بڑا افسوس ہوا کہ آپ کو صرف اس قصور پر مدرسے سے نکال دیا گیا کہ درسِ حدیث کے دوران میں ایک حدیث کے مضمون پر آپ کو شک لاحق ہوا تھا اور پڑھانے والے مولوی صاحب آپ کا شک رفع کرنے سے عاجز تھے۔ قصور تو اصل میں اُن مولوی صاحب کا تھا جو اس چیز کی تعلیم دینے بیٹھ گئے تھے جس کی مشکلات کو حل کرنے کی قابلیت ان میں نہ تھی۔ لیکن افسوس کہ اس کی سزا آپ کو دے دی گئی۔ ایسی ہی حرکات سے ہمارے ہاں کے بعض علمائے کرام اچھے خاصے صحیح الفکر اور سلیم الطبع لوگوں کو گمراہیوں کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔

آپ کو جس حدیث کے مضمون نے پریشانی میں ڈالا ہے وہ دراصل ایک بڑے مسئلے کے فروع میں سے ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ بچے جو سنِ رشد کو پہنچنے اور کسی مذہبِ حق یا مذہبِ باطل کو بالارادہ اختیار کرنے سے پہلے ہی مر گئے ہوں اُن کا انجام کیا ہو گا۔ اس مسئلے پر روشنی ڈالنے والی بہت سی احادیث پائی جاتی ہیں، مگر ان میں بڑا

اختلاف ہے۔ بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب جنت میں جائیں گے۔ بعض کہتی ہیں کہ کفار و مشرکین کے بچے دوزخ میں اور اہلِ ایمان کے بچے جنت میں جائیں گے۔ اور بعض سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے معاملے کا فیصلہ اپنے اس علم کے لحاظ سے کرے گا کہ وہ کیا کرنے والے تھے، یعنی جوان ہو کر وہ مومن صالح بنتے یا کچھ اور۔ انہی مختلف المعنی احادیث میں سے ایک وہ حدیث بھی ہے جس کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ وہ اُن احادیث کے سلسلے میں آتی ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ کفار و مشرکین کے بچے جہنم میں جائیں گے۔ یا بالفاظِ دیگر بچوں کے ساتھ آخرت میں وہی معاملہ کیا جائے گا جس کے مستحق ان کے والدین ہونگے۔

جب احادیث میں اس طرح کا کھلا کھلا اختلاف واقع ہو جائے، اور ان کو جمع کر کے کوئی ایسا مفہوم تلاش کرنا مشکل ہو جس میں سب کے درمیان مطابقت پیدا ہو سکے، تو پھر یہ دیکھنا ضروری ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کون سند کے لحاظ سے زیادہ قوی اور معنی کے لحاظ سے قرآن اور دین کے اصولِ عامّہ کے مطابق ہیں۔ جو احادیث ایسی ہوں ان کو دوسری تمام احادیث پر ترجیح دی جائے گی اور انہی کو قبول کیا جائے گا۔

علمائے محققین نے اس قاعدے کے مطابق ان مختلف احادیث کو جانچ کر مسئلۂ زیرِ بحث میں جس چیز کو مذہب صحیح قرار دیا ہے وہ یہ ہے کہ ایسے تمام بچے جنت میں جائیں گے، کیونکہ اسی مضمون کی احادیث زیادہ قوی ہیں، قرآن کے مطابق ہیں، اور دین کے اصولِ عامّہ بھی انہی کی تائید کرتے ہیں۔ چنانچہ امام نوویؒ شرح مسلم میں اس مسئلے پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"رہے مشرکین کے بچے تو ان کے بارے میں تین مذہب ہیں۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ وہ اپنے آباء و اجداد کے ساتھ جہنم میں جائیں گے۔ ایک گروہ ان کے معاملہ میں توقف کرتا ہے۔ اور تیسرا مذہب یہ ہے کہ وہ اہلِ جنت میں سے ہیں۔ یہی مذہب صحیح ہے، اسی کو محققین نے اختیار کیا ہے، اور اس کی تائید بہت سی چیزوں سے ہوتی ہے۔ مثلاً بخاری کی وہ حدیث جس میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں حضرت ابراہیمؑ کو جنت میں دیکھا اور ان کے ارد گرد لوگوں کے بچے تھے، صحابۂ کرام نے پوچھا کیا ان میں مشرکین کے بچے بھی تھے، حضورؐ نے فرمایا ہاں مشرکین کے بچے بھی تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا "ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک کہ کوئی رسول نہ بھیج دیں"۔ اور یہ بات متفق علیہ ہے کہ بچے پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے

لعنہ رسول کا قول اس پر لازم ہوتا ہے جب تک کہ وہ بالغ نہ ہو جائے" (کتاب القدر۔ باب معنی کل مولود یولد علی الفطرۃ)۔

جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے وہ اگرچہ اس کی صراحت تو نہیں کرتا کہ غیر مکلف انسان سب کے سب جنت میں جائیں گے، مگر اس معاملہ میں وہ صاف فیصلہ دیتا ہے کہ جہنم میں صرف وہی لوگ جائیں گے جو انبیاء علیہم السلام کی دعوت سے منہ موڑ کر شیطان کا اتباع کریں لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (النساء، رکوع ۲۳) لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ (ص۔ رکوع ۵)، كُلَّمَا أُلْقِيَ فِيهَا فَوْجٌ سَأَلَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَذِيرٌ قَالُوا بَلَى قَدْ جَاءَنَا نَذِيرٌ فَكَذَّبْنَا (الملک۔ رکوع ۱)، لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (البقرہ۔ رکوع ۴۰)۔ یہ اور بہت سی دوسری آیات اس معاملہ میں بالکل صاف ہیں۔

اب رہ گئیں احادیث، تو ان میں بکثرت ایسی صحیح روایات موجود ہیں جو یا تو اس کی صراحت کرتی ہیں کہ بچے جنت میں جائیں گے، یا اس پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ عذاب آخرت سے محفوظ رہیں گے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور وہ روایت ہے جو صحیحین میں کئی طریقوں سے آئی ہے کہ

ما من مولود الا یولد علی الفطرۃ فابواہ یہودانہ وینصرانہ ویمجسانہ کما تنتج البہیمۃ بہیمۃ جمعاء ہل تحسون فیہا من جدعاء

کوئی بچہ ایسا نہیں ہے جو فطرت پر پیدا نہ ہوتا ہو۔ بعد میں اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی، مجوسی بنا لیتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جانور کے پیٹ سے پورا سالم جانور پیدا ہوتا ہے، کیا ان میں سے کسی کو تم کن کٹا پاتے ہو؟ (یعنی اس کے کان تو بعد میں جاہل لوگ اپنی رسموں کی وجہ سے کاٹتے ہیں)

اس حدیث میں فطرت پر پیدا ہونے سے مراد فطرت اسلام پر پیدا ہونا ہے، کیونکہ یہودیت، نصرانیت اور مجوسیت کو اس کے بالمقابل بیان کیا گیا ہے۔ نیز اس کی بعض روایتوں میں علی فطرۃ الاسلام و علی ھذہ الملۃ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں جو بات کو بالکل واضح کر دیتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ خود بخود نکلتا ہے کہ بچہ خواہ کافر ماں باپ ہی کا کیوں نہ ہو، اپنے والدین کے مذہب پر نہیں بلکہ اس فطری مذہب پر پیدا ہوتا ہے

جس کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْہَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ (الروم رکوع ۴) وہ ماں کے پیٹ سے کفر لے کر نہیں آتا، بلکہ کفر، شرک، دہریت جو کچھ بھی اس کو لاحق ہوتی ہے، بعد میں اپنے ماحول سے لاحق ہوتی ہے۔ اب اگر وہ اُس عمر کو نہ پہنچا ہو جس میں یہ بیرونی اثرات اس پہ پڑیں اور وہ ان کو قبول کر کے کافر یا مشرک یا دہریہ بنے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کی بنائی ہوئی اس صحیح فطرت پر دنیا سے رخصت ہو گیا جو کفر اور معصیت سے پاک ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس دار العذاب میں بھیجا جائے جو صرف کافروں اور فاسقوں ہی کے لیے بنایا گیا ہے۔

اسی مضمون سے ملتی جلتی حدیث وہ ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ

انی خلقت عبادی حنفاء کلھم وانھم اتتھم الشیاطین فاجتالتھم عن دینھم (مسلم)	میں نے اپنے سب بندوں کو حنیف پیدا کیا، اور پھر ان کے پاس شیاطین آئے اور انھیں ان کے دین سے ہٹا لے گئے۔

اس حدیث کی بعض روایتوں میں حنفاء مسلمین کے الفاظ ہیں یعنی اللہ نے ان کو مسلم حنیف پیدا فرمایا تھا۔ اس سے بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو انسان شیطانی گمراہیوں کو اخذ و اختیار کرنے سے پہلے مر جائیں وہ اسی حنیفیت کے عالم میں مرتے ہیں جو ان کا پیدائشی دین ہے، اور ان کے عذاب آخرت میں مبتلا ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد وہ احادیث ملاحظہ ہوں جن میں صراحت ہے کہ کافر و مومن سب کے بچے جنت میں جائیں گے۔ اس معنی میں سب سے زیادہ معتبر وہ حدیث ہے جو امام بخاری نے کتاب التعبیر اور کتاب الجنائز میں حضرت سَمُرہ بن جُندُب سے نقل کی ہے۔ اس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز صبح کی نماز کے بعد حضور نے اپنا ایک طویل خواب سنایا جو آپ نے رات کے وقت دیکھا تھا۔ اس خواب میں حضور کو عذاب اور ثواب کے بہت سے مناظر دکھائے گئے تھے، اور ایک جگہ جنت میں آپ کی ملاقات ایک طویل القامت بزرگ سے ہوئی تھی جن کے گرد و پیش بہت سے بچے (اولاد الناس) تھے۔ سیر کرانے والے فرشتے (جبریل) نے آپ کو بتایا کہ یہ بزرگ ابراہیم علیہ السلام ہیں، واما الولدان الذین حولہ فکل مولود مات علی الفطرۃ "رہے یہ بچے جو ان کے گرد و پیش ہیں، تو ان میں ہر وہ بچہ شامل ہے جو فطرت پر مرا ہے" اس کی تشریح چاہتے ہوئے حاضرین میں

سے ایک صاحب نے سوال کیا "اولاد المشرکین؟" کیا ان میں مشرکین کے بچے بھی شامل تھے؟ حضور نے فرمایا "اولاد المشرکین؟" ہاں مشرکین کے بچے بھی۔"

اس کی تائید اُس روایت سے بھی ہوتی ہے جو مسند احمد میں خنسا بنت معاویہ بن صریم سے مروی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ میری پھوپھی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا من فی الجنۃ؟ جنتی کون ہے؟ حضور نے فرمایا النبی فی الجنۃ، والشہید فی الجنۃ والمولود فی الجنۃ "نبی جنتی ہے، شہید جنتی ہے، بچہ جنتی ہے۔"

بعض علماء نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قرآن مجید میں جن کو غلمان اور ولدان مخلدون (ہمیشہ حالت طفلی ہی میں رہنے والے لڑکے) کہا گیا ہے وہ یہی بچے ہوں گے۔ یہ بات بہت قرین قیاس معلوم ہوتی ہے اور بعید نہیں کہ اس کی صورت یہ ہو کہ جن بچوں کے والدین جنتی نہ ہوں وہ اہل جنت کے دائمی و ابدی خادم بنا دیئے جائیں، واللہ اعلم بالصواب۔

اس بات کو اصل قرار دینے کے بعد دوسری تمام احادیث کی یا تو اس کے مطابق تاویل کی جائے گی، یا پھر اُن کے بارے میں توقف کیا جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی جگہ صحیح ہوں مگر ان کے کوئی ایسے معنی ہوں جو روایت کردہ الفاظ سے پوری طرح ظاہر نہ ہو رہے ہوں۔

مطبوعات

قولِ سدید | تالیف:- شکر اللہ خاں منصور صاحب بی، اے، ایل، ایل، بی- ناشر: احمدیہ انجمن اشاعت اسلام احمدیہ بلڈنگس، لاہور- صفحات ۴۰۶ قیمت درج نہیں- طباعت کا معیار گوارا-

یہ کتاب اُس طویل سلسلۂ بحث و مناظرہ کی ایک کڑی ہے جو قریب قریب چالیس سال سے مرزا غلام احمد صاحب کے متبعین کے درمیان اس مسئلے پر چھڑا ہوا ہے کہ مرزا صاحب کا دعویٰ آخر تھا کیا- ایک گروہ کے نزدیک ان کا دعویٰ نبوت کا تھا- اور دوسرے کے نزدیک مجدد و مہدی اور مسیح موعود ہونے کا- یہ کتاب دوسرے گروہ کی طرف سے پہلے گروہ کے خلاف حجت کے طور پر لکھی گئی ہے- لیکن واقعہ یہ ہے کہ مرزا صاحب دونوں گروہوں کے لیے کافی وزنی حجتیں چھوڑ گئے ہیں- یہ بے چارے اگر قیامت تک بھی اس بحث کا سلسلہ جاری رکھیں تو کم از کم مرزا صاحب کے اقوال و افعال سے تو کوئی کسی پر حجت تمام نہ کر سکے گا- مرزا صاحب کی شخصیت "طرفہ تماشا" ہونے کی وجہ سے نفسیات کے ایک طالب علم کے لیے درحقیقت اپنے اندر بڑی دلچسپی کا سامان رکھتی ہے- اس کے مطالعہ سے وہ ایک نبی اور ایک "متنبی" کی نفسیاتی کیفیات کا فرق بخوبی سمجھ سکتا ہے- نبوت چونکہ کوئی کسبی چیز نہیں بلکہ وہبی ہے، اور اس کے اقرار و انکار پر ایمان و کفر کا دارومدار ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو اس نعمت سے سرفراز فرمایا ہے ان کی بعض نفسیاتی خصوصیات بھی دوسرے لوگوں سے بالکل الگ رکھی ہیں- ان صفحات میں یہ موقع نہیں کہ ہم ان کی تفصیل بیان کر سکیں اس لیے یہاں ہم صرف تین چیزوں کا ذکر کر دینے پر اکتفا کرتے ہیں-

۱- انبیاء کی سب سے پہلی نفسیاتی خصوصیت یہ ہے کہ اُن کا ذہن نہایت ہی صاف شفاف ہوتا ہے ہر قسم کی فکری الجھن سے پاک اور منزہ- وہاں کی بات واضح اور دوٹوک ہوتی ہے- ان کے کلام میں اضطراب کے بجائے وثوق ہوتا ہے- وہ نہ ژولیدہ بیان ہوتے ہیں، نہ متضاد باتیں کرتے ہیں، اور نہ دورُخی بات کیا کرتے ہیں- ان کی طبیعت میں سلامت، مزاج میں اعتدال، سیرت میں مضبوطی، اخلاق میں پاکیزگی، معاملات

میں راست بازی، کلام میں صداقت اور قول و قرار میں پختگی ہوتی ہے۔

۲۔ وہ سوسائٹی کے بہترین اور شریف ترین انسان تو ضرور ہوتے ہیں، مگر نبوت کی جانب کسی تدریجی ارتقاء یا دانستہ پیش قدمی کا کوئی نشان نہیں پایا جاتا۔ اُن کی گفتگو اور اندازِ زیست سے یہ بالکل پتہ نہیں چلتا کہ وہ کسی "خاص منصب" پر پہنچنے کے لیے کوئی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ اُن کے الفاظ میں کوئی چیز اشارے یا کنایہ کی شکل میں بھی ایسی ظاہر نہیں ہوتی جس سے معلوم ہو سکے کہ یہ حضرات اپنے سینے میں کچھ عزائم پال رہے ہیں جن کا اظہار موقع و محل کی موزونیت کے ساتھ ہونے والا ہے۔ ان کا دعوائے نبوت اچانک دنیا کے سامنے آتا ہے۔ اس سے ایک ساعت پہلے تک ان کے قریب ترین ماحول میں بھی کسی کے وہم و گمان میں یہ بات نہیں ہوتی کہ وہ عنقریب کوئی بڑا قدم اٹھانے والے ہیں۔ یہ اس بات کا ایک اہم ثبوت ہے کہ نبوت سراسر ایک وہبی چیز ہے۔ جو لوگ بالارادہ اپنی کوشش سے کچھ بنتے ہیں وہ ایک دن میں نہیں بن جاتے بلکہ بتدریج ایک منزل کی طرف بڑھتے ہیں اور ان کی پیش قدمی کے مراحل سب کے سامنے گزرتے ہیں۔ اُن کے کام اور کلام اور انداز کار سے ایک دیدہ ور فوراً یہ بھانپ جاتا ہے کہ عنقریب کوئی "افشائے راز" ہونے والا ہے جس کے لیے پہلے سے تیاریاں ہو رہی ہیں، یا زمین ہموار کی جا رہی ہے۔

۳۔ انبیاء علیہم السلام نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے تو اپنے متعلق کسی قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کرتے لیکن جب انہیں اللہ تعالیٰ اس منصب پر فائز کر دیتا ہے تو پھر وہ اپنے مشن کا آغاز اسی دعویٰ سے کرتے ہیں۔ اس دعوے پر انہیں بے حد اصرار ہوتا ہے۔ اسی کے اقرار کو وہ ایمان اور اس کے انکار کو کفر قرار دیتے ہیں۔ اس دعویٰ میں وہ کسی قسم کی مداہنت یا مصالحت کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اپنے اس موقف سے وہ کبھی پیچھے نہیں ہٹتے۔ وہ کبھی ایمان و ایقان کے معاملہ میں گوریلا وار نہیں لڑتے کہ جب موقع مناسب دیکھا تو آگا ایک قدم آگے بڑھا لیا اور جب محسوس کیا کہ اب مخالفت زیادہ ہے، اور دشمن کی مزاحمت مضبوط ہے تو جھٹ سے دو تین قدم پیچھے کی طرف سرکا لیے۔ ان کے دل و دماغ کے کسی کونے میں کسی قسم کا کوئی تذبذب نہیں ہوتا۔ وہ نہایت واضح طور پر جانتے ہیں کہ اُن کا دعویٰ کیا ہے اور اس کے تقاضے کیا ہیں۔

ان نفوسِ قدسیہ کے برعکس جو لوگ مفتری اور کاذب ہوتے ہیں، جو اپنی طرف سے باتیں گھڑ گھڑ کر، اور انھیں خدا کی طرف منسوب کر کے اپنی عظمت و سطوت کی دکان چمکانے کا ارادہ رکھتے ہیں انہیں اپنے دعاوی پر کبھی قرار نہیں ہوتا۔ اُن کے دعاوی حالات کی گردش کے ساتھ ہر آن بدلتے رہتے ہیں۔ اُن کی ساری زندگی ہی دعووں کی تعبیر میں گزر جاتی ہے۔ اُن کے اعتقادات صاف اور واضح نہیں ہوتے بلکہ وہ عقائد کی ایک بھول بھلیاں بناتے ہیں۔ ان کا سارا مذہب ایک چیستان ہوتا ہے اور یہ اپنے پیرؤں کو تاویلات کے ایسے گھنے جنگل میں لا کر چھوڑ دیتے ہیں، جہاں سے انہیں کہیں بھی سیدھی راہ نہیں ملتی۔ اُن کے دماغ میں سخت الجھاؤ ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ مبہم گفتگو کرتے ہیں اور کوئی چیز بھی وثوق کے ساتھ نہیں کہتے۔ وہ کسی وقت بھی اپنے موقف پر قائم نہیں رہتے۔ آج اگر وہ ایک چیز کہہ رہے ہیں تو کل دوسری اور پرسوں تیسری۔ اس وقت اگر ایک قول کی تعبیر اُن کے نزدیک ایک ہے تو دوسرے وقت میں بالکل دوسری۔

انہی وجوہ کی بنا پر آپ دیکھتے ہیں کہ کسی نبی کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد سماج صرف دو گروہوں میں منقسم ہوا۔ ایک اس کی نبوت کا اقرار کرنے والے، دوسرے اس سے انکار کرنے والے۔ اس کے برخلاف جن لوگوں نے ذہنی اختلال اور فکری انتشار کی وجہ سے چند بے سر و پا باتیں کہنی شروع کیں، اور پھر انہیں غلطی سے الہام و وحی سمجھ کر یا قرار دے کر مختلف اوقات میں مختلف دعوے کیے۔ اُن کے متبعین کا اپنے رہبروں کے معاملہ میں کسی ایک نقطہ پر متحد نہ ہونا بالکل ایک فطری امر ہے۔ چنانچہ یہی چیز ہم آج مرزا غلام احمد صاحب کے معتقدین میں پاتے ہیں۔ انھوں نے مختلف اوقات میں ایسی متضاد باتیں کہی ہیں کہ آدمی حیران ہو جاتا ہے کہ انہیں کیا سمجھا جائے۔ اسی لیے اُن کے اپنے ماننے والے ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ آخر اُنکا موقف کیا تھا۔ قادیانی گروہ، جس کی سربراہی مرزا بشیر الدین محمود کر رہے ہیں، انہیں نبی مانتا ہے۔ اس کے برعکس لاہوری گروہ انہیں ایک مجدد خیال کرتا ہے۔ ایک نبی اور مجدد میں فرق اتنا واضح اور نمایاں ہوتا ہے کہ اس میں کسی التباس کی گنجائش نہیں ہوتی۔ دنیا کے دوسرے عجائبات کی طرح یہ بھی ایک عجوبہ ہے کہ اس دور میں ایک شخص کی دورخی باتوں نے نبوت اور "تجدید" کو ایسا گڈمڈ کیا ہے کہ ابھی تک اُس کے بارے میں یہ جھگڑا جاری ہے کہ وہ نبی تھا یا مجدد؟

ان لوگوں نے غلطی سے یہ فرض کر لیا ہے کہ نبی اور مجدد میں کوئی نوعی فرق نہیں بلکہ نبی مجدد ہی کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے۔ یہ نبوت کو سرکاری عہدوں کی طرح ایک اونچا عہدہ سمجھتے ہیں جس پر نیچے درجوں سے ترقی کرتے ہوئے ایک شخص پہنچ جاتا ہے، اور اس پر پہنچنے میں اس کی اپنی کوشش کا بھی کچھ دخل ہوتا ہے حالانکہ یہ سراسر باطل خیال ہے۔ نبوت ایک وہبی چیز ہے۔ وہ حاصل نہیں کی جاتی بلکہ عطا کی جاتی ہے۔ نبی ابتدا ہی سے براہ راست نبی مقرر کیا جاتا ہے۔ وہ اس مقام تک پہنچنے کے لیے کوئی منصوبہ بندی نہیں کرتا اسے اس منصب کے اعلان کے لیے "تاویلات و تعبیرات کی پُرپیچ" راہوں پر سے گزرنا نہیں پڑتا۔ وہ زندگی میں صرف یہی دعویٰ کرتا ہے اور آخر دم تک اس پر قائم رہتا ہے۔ اس کے لیے نہ وہ حالات کے تیور دیکھتا ہے اور نہ اس کا طرزِ عمل ایک طالع آزما کا سا ہوتا ہے کہ پہلے ایک فیلر چھوڑ کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ کیا حالات اس قسم کے اعلان کے لیے سازگار بھی ہیں یا نہیں، اور پھر جب وہ انہیں حسبِ منشا پلٹتے تو کچھ گول مول بات کر دے لیکن جب یہ محسوس کرے کہ ابھی فضا ہموار نہیں ہے تو فوراً اپنے دعوے سے دستبردار ہو جائے۔

مرزا غلام احمد صاحب کی نبوت ایک ماہر سیاست دان کی طرح موقع کی مناسبت کے لحاظ سے ارتقائی منازل طے کرتی رہی ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے ایک خادم اسلام ہونے کا دعویٰ کیا اور دین کی اتنی خدمت نہ کی جتنا کہ اپنی اس خادمیت کا ڈھنڈورا پیٹا۔ اس کے بعد جب یہ دیکھا کہ مسلمانوں کی یہ پریشان حال قوم جسے انگریز ملیامیٹ کرنے کے درپے تھا، کسی حد تک ان کی طرف متوجہ ہونے لگی ہے تو انھوں نے فوراً مجددیت کا دعویٰ کر دیا اور جب اس سادہ لوح قوم پر یہ جادو بھی چل گیا تو پھر اُس بے چاری کو نبوت کے دام میں پھنسانا شروع کیا۔ یہ ڈراما جس طریق سے کھیلا گیا وہ بڑا ہی دلچسپ ہے۔ ہم یہاں اس کی چند مثالیں دیتے ہیں۔

مرزا صاحب نے سب سے پہلے اپنے آپ کو ایک سیدھا سادہ مسلمان ظاہر کیا:

"میں ان تمام امور کا قائل ہوں جو اسلامی عقائد میں داخل ہیں اور جیسا کہ اہل سنت جماعت کا عقیدہ ہے، ان سب باتوں کو مانتا ہوں جو قرآن اور حدیث کی رو سے مسلم الثبوت ہیں اور سیدنا و مولانا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ختم المرسلین کے بعد کسی دوسرے مدعی نبوت و رسالت کو کاذب اور

کافر جانتا ہوں۔ میرا یقین ہے کہ وحی رسالت حضرت آدم صفی اللہ سے شروع ہوئی اور جناب رسول اللہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گئی۔" (مرزا غلام احمد قادیانی کا اشتہار ۲ اکتوبر ۱۸۹۱ء)

"کیا ایسا بدبخت مفتری جو خود رسالت و نبوت کا دعویٰ کرتا ہے، قرآن شریف پر ایمان رکھ سکتا ہے؟ اور کیا ایسا وہ شخص جو قرآن شریف پر ایمان رکھتا ہے اور آیت ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین کو خدا کا کلام یقین کرتا ہے وہ کہہ سکتا ہے کہ میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد رسول اور نبی ہوں۔" (انجام آتھم۔ صـ۲۷)

"میں جانتا ہوں کہ ہر وہ چیز جو مخالف ہے قرآن کے وہ کذب و الحاد و زندقہ ہے۔ پھر میں کس طرح نبوت کا دعویٰ کروں جب کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں۔" (حمامۃ البشریٰ صـ۹۶)

"اے لوگو! دشمن قرآن نہ بنو اگر خاتم النبیین کے بعد وحی نبوت کا نیا سلسلہ جاری نہ کرو۔ اس خدا سے شرم کرو جس کے سامنے حاضر کیے جاؤ گے۔" (آسمانی فیصلہ صـ۲۵)

اس کے بعد دیکھیے ولایت کے پردے میں حامل وحی اور صاحب معجزات ہونے کا دعویٰ کس انداز سے کیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ ایک اگلا قدم ہے، اس لیے بہت پھونک پھونک کر رکھا گیا ہے۔ اس میں لوگوں کے ردِعمل کو بھی معلوم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اور دعویٰ کی زبان بڑی ہی نرم ہے:

"ان پر واضح رہے کہ ہم بھی نبوت کے مدعی پر لعنت بھیجتے ہیں اور لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے قائل ہیں اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت پر ایمان رکھتے ہیں اور وحی نبوت نہیں بلکہ وحی ولایت جو زیر سایہ نبوت محمدیہ اور باتباع آں جناب صلی اللہ علیہ وسلم اولیاء اللہ کو ملتی ہے، اس کے ہم قائل ہیں اور اس سے زیادہ جو شخص ہم پر الزام لگا کے وہ تقویٰ اور دیانت کو چھوڑتا ہے۔"

(اشتہار مرزا غلام احمد قادیانی مورخہ ۲۰ شعبان ۱۳۱۴ھ)

"اوّل اس عاجز کی اس بات کو یاد رکھیں کہ ہم لوگ معجزے کا لفظ اس محل پر بولا کرتے ہیں جب کوئی خرق عادت کسی نبی یا رسول کی طرف منسوب ہو۔ لیکن یہ عاجز نہ نبی ہے اور نہ رسول ہے صرف اپنے نبی معصوم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ادنیٰ خادم اور پیرو ہے! در اسی رسولِ مقبول کی برکت

اور متابعت سے یہ انوار و برکات ظاہر ہو رہے ہیں۔ سو اس جگہ کرامت کا لفظ موزوں ہے نہ معجزے کا۔" (مرزا غلام احمد قادیانی کا ارشاد مندرجہ اخبار الحکم قادیان نمبر ۲۳ جلد ۵ منقول از تمر الہدی ص ۳۴)

یہ قدم جما لینے کے بعد دعوائے نبوت کی طرف جس ہوشیاری کے ساتھ پیش قدمی کی گئی اس کی ایک جھلک مندرجہ ذیل اقتباس میں ملاحظہ فرمائیں:۔

"ماسوا اس کے اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ عاجز خدا تعالیٰ کی طرف سے اس امت کے لئے محدث ہو کر آیا ہے اور محدث بھی ایک معنی سے نبی ہوتا ہے۔ گو اس کے لیے نبوتِ تامہ نہیں مگر تاہم جزوی طور پر وہ ایک نبی ہی ہے۔ کیونکہ وہ خداوند تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کا شرف رکھتا ہے۔ امورِ غیبیہ اس پر ظاہر کیے جاتے ہیں۔ اور رسولوں اور نبیوں کی وحی کی طرح اس کی وحی کو بھی دخلِ شیطان سے منزہ کیا جاتا ہے۔ اور مغزِ شریعت اس پر کھولا جاتا ہے۔ اور بعینہٖ انبیا کی طرح مامور ہو کر آتا ہے۔ اور انبیاء کی طرح اس پر فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے تئیں باآوازِ بلند ظاہر کرے۔ اور اس سے انکار کرنے والا ایک حد تک مستوجبِ سزا ٹھہرتا ہے۔ اور نبوت کے معنی بجز اس کے کچھ نہیں کہ امورِ متذکرہ بالا اس میں پائے جائیں۔" (توضیح مرام ص ۱۸ مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی)

اس اقتباس کو بغور مطالعہ کیجیے اور دیکھیے کہ نبوت کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کس ہوشیاری اور احتیاط سے کام لیا جا رہا ہے۔ ان الفاظ میں اس بات کا پورا التزام موجود ہے کہ اگر ضرورت محسوس ہو تو نبوت سے فوراً دستکش ہو جانے میں بھی کوئی خاص زحمت پیش نہ آئے۔

اب ذرا اس سفر کے اگلے مراحل ملاحظہ ہوں۔ پہلے مسیح موعود ہونے سے انکار کر کے صرف مثیلِ مسیح ہونے کا دعویٰ کیا گیا:

"اس عاجز نے جو مثیلِ موعود ہونے کا دعویٰ کیا ہے، جس کو کم فہم لوگ مسیح موعود خیال کر بیٹھے ہیں، یہ کوئی نیا دعویٰ نہیں جو آج ہی میرے منہ سے سنا گیا ہو، بلکہ یہ وہی پرانا الہام ہے جو میں نے خدا تعالیٰ سے پا کر براہینِ احمدیہ کے کئی مقامات پر بہ تصریح درج کر دیا تھا جس کے شائع کرنے پر سات سال سے بھی زیادہ عرصہ گزر گیا ہو گا۔ میں نے یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا کہ میں مسیح ابنِ مریم ہوں، جو شخص یہ

الزام میرے پر لگا دے وہ سراسر مفتری اور کذاب ہے بلکہ میری طرف سے عرصہ سات آٹھ سال سے برابر یہی شائع ہو رہا ہے کہ میں مثیلِ مسیح ہوں یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعض روحانی خواص طبع اور عادات اور اخلاق وغیرہ کے خدائے تعالیٰ نے میری فطرت میں رکھے ہیں۔"

(اشتہار مرزا غلام احمد قادیانی مورخہ ۱۱ر فروری ۱۸۹۱ء)

لیکن کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ تحفۂ گولڑویہ میں صاف صاف "مسیح موعود" ہونے کا دعویٰ کر دیا گیا جس سے پہلے انکار کیا گیا تھا:

"میرا دعویٰ یہ ہے کہ میں وہ مسیح موعود ہوں جس کے بارے میں خدا تعالیٰ کی تمام پاک کتابوں میں پیش گوئیاں ہیں کہ وہ آخری زمانے میں ظاہر ہوگا۔"

پھر ایک پہلو سے نبی اور ایک پہلو سے امتی ہونے کا دعویٰ کیا گیا، اور اس کے لیے لفظ خاتم النبیین کی ایک نرالی اور عجیب و غریب تاویل گھڑی گئی:

"اسی طرح اوائل میں میرا عقیدہ تھا کہ مجھ کو مسیح سے کیا نسبت ہے۔ وہ نبی ہے اور خدا کے بزرگ مقربین میں سے ہے۔ اور اگر کوئی امر میری فضیلت کی نسبت ظاہر ہوتا تو میں اس کو جزوی فضیلت قرار دیتا تھا۔ مگر بعد میں خدا کی وحی بارش کی طرح میرے پر نازل ہوئی۔ اس نے مجھے اس عقیدے پر قائم نہ رہنے دیا اور صریح طور پر نبی کا خطاب مجھے دے دیا گیا۔ مگر اس طرح سے کہ ایک پہلو سے نبی اور ایک پہلو سے امتی۔" (حقیقۃ الوحی ص ۱۴۹)

"خدا نے اس زمانے میں محسوس کیا کہ یہ ایسا فاسد زمانہ آگیا ہے جس میں ایک عظیم الشان مصلح کی ضرورت ہے اور خدا کی مہر نے یہ کام کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنے والا اس درجہ کو پہنچا کہ ایک پہلو سے وہ امتی ہے اور ایک پہلو سے نبی۔ کیونکہ اللہ جل شانہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صاحبِ خاتم بنایا یعنی آپ کو افاضۂ کمال کے لیے مہر دی جو کسی اور نبی کو ہرگز نہیں دی گئی۔ اسی وجہ سے آپ کا نام خاتم النبیین ٹھہرا یعنی آپ کی پیروی کمالات نبوت بخشتی ہے اور آپ کی توجہ روحانی نبی تراش ہے اور یہ قوت قدسیہ کسی اور نبی کو نہیں ملی۔" (حقیقۃ الوحی ص ۹۷)

اس طرح زمین ہموار کر کے آخر کار صاف صاف نبی اور رسول ہونے کا دعویٰ کر دیا گیا:

"پس میں جب کہ اس مدت تک ڈیڑھ سو پیش گوئی کے قریب خدا کی طرف سے پا کر بچشم خود دیکھ چکا ہوں کہ صاف طور پر پوری ہو گئیں تو میں اپنی نسبت نبی یا رسول کے نام سے کیونکر انکار کر سکتا ہوں اور جب کہ خود خدا تعالیٰ نے یہ نام میرے رکھے ہیں تو میں کیونکر رد کر دوں یا کیونکر اس کے سوا کسی سے ڈروں" (رسالہ "ایک غلطی کا ازالہ")

"اور میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اسی نے مجھے بھیجا ہے اور اسی نے میرا نام نبی رکھا ہے اور اسی نے مجھے مسیح موعود کے نام سے پکارا ہے اور اسی نے میری تصدیق کے لیے بڑے بڑے نشان ظاہر کیے جو تین لاکھ تک پہنچتے ہیں" (تتمہ حقیقۃ الوحی ص ۶۸)

ہم حیران ہیں کہ مرزا صاحب کے اس ریکارڈ کو دیکھ کر اگر کوئی ان کو نبی مانتا ہے تو کیسے، اور مجدد مانتا ہے تو کیوں۔ یہ یا تو ایک نفسیاتی مریض کا ریکارڈ ہے، یا پھر ہلکے سے ہلکے الفاظ میں ایک فریب کار انسان کا ریکارڈ۔ نبوت کا دروازہ اگر کھلا ہوا بھی ہوتا تو کوئی صاحبِ عقل و خرد آدمی ان چالاکیوں اور احتیاطوں کے ساتھ تدریج بننے والے شخص کو کبھی نبی ماننے کے لیے تیار نہ ہو سکتا تھا۔ رہا مجدد کا مقام، تو وہ بھی کسی ایسے آدمی کے لیے موزوں نہیں جو خدمتِ دین کا نام لے کر اٹھے اور آئے دن نت نئے دعوے کر کے فتنوں کی فصل پر فصل بوتا چلا جائے۔ بخصوصیت کے ساتھ ختمِ نبوت کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنے والا شخص تو (خواہ اس کا دعویٰ صریح ہو یا تاویلوں کے غلاف میں لپٹا ہوا) دین کا مجدد بہرحال نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے دائرۂ دین ہی میں کوئی جگہ نہیں کجا کہ دین کے اعلیٰ مراتب میں سے کوئی مرتبہ اس کو دیا جائے۔

جماعت اسلامی پاکستان بزبان انگریزی	مرتب و ناشر- ایم۔ آئی۔ فاروقی، سیکرٹری شعبۂ نشر و اشاعت جماعت اسلامی پاکستان۔ صفحات ۹۲ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔

امسال مئی کے آخری ہفتہ میں امریکہ کے مشہور شہر شکاگو میں کتابوں کی ایک بین الاقوامی نمائش منعقد ہوئی اس نمائش میں جماعت اسلامی پاکستان کے مرکزی مکتبہ نے بھی شرکت کی۔ موضوع کی مناسبت اور اہمیت کے پیشِ نظر یہ ضروری سمجھا گیا کہ جماعت اسلامی پاکستان کا ایک مختصر سا تعارف پیش کیا جائے تاکہ جو حضرات جماعت

کے اسٹال پر تشریف لائیں وہ جان سکیں کہ جماعت کے اغراض و مقاصد کیا ہیں، اس کی تنظیم کن خطوط پر کی گئی ہے اور اس نے آج تک کیا کچھ حاصل کیا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب اسی مقصد کے پیشِ نظر مرتب کی گئی ہے۔ اس میں مندرجۂ ذیل ابواب ہیں :۔

مغرب کے نام ؛ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا کارنامہ۔ جماعت کی مطبوعات۔ بعض اہم مطبوعات کا تعارف۔ جماعت اسلامی کے متعلق بعض اہم معلومات اور اعداد و شمار، مثلاً اس کی تنظیمی ساخت، مشاورتی کمیٹیاں، طریقِ کار، ارکان و متفقین، جمہوریت و ڈسپلن، کارکنوں کی تربیت، فلاحِ محنت کاراں، سوشل سروس، تعلیم بالغاں، اشاعتِ لٹریچر، اس کا مالیاتی نظام، دستور اور سیاسی کردار۔ فاضل مؤلف نے پہلے باب میں مختصر طور پر مگر نہایت سلجھے ہوئے انداز میں جماعتِ اسلامی کا مقصدِ وجود بیان کیا ہے اور اہلِ مغرب سے یہ دردمندانہ اپیل کی ہے کہ وہ اسلام اور اس کے بارے میں مسلمانوں کے نازک احساسات کو سمجھنے کی کوشش کریں کیونکہ جب تک وہ اُن کے دین کے معاملہ میں اپنے رویّہ کو بدلنے پر تیار نہیں ہونگے، وہ مسلم قوم کے دل میں اپنے لیے عزت و احترام کی کوئی جگہ حاصل نہ کریں گے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے بالکل درست فرمایا ہے

"اہلِ مغرب کو غالباً ابھی تک اس امر کا احساس نہیں ہوا کہ اُن کے اور مسلمانوں کے درمیان کتنی کشیدگی اور بے اعتمادی مستشرقین کے اس مکروہ پراپیگنڈہ کی وجہ سے ہے جو وہ صدیوں سے اسلام کے خلاف کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کی رنجیدگی کی سب سے بڑی اور بنیادی وجہ یہی ہے۔ اہلِ مغرب کے لیے یہ کسی طرح بھی درست نہیں کہ وہ اسلام کے خلاف ایسی بے بنیاد باتیں گھڑتے رہیں جن کا کوئی ثبوت نہ تو ہمیں قرآن پاک سے ملتا ہے نہ حدیث سے۔ جب تک یہ صورتِ حال قائم رہے گی مسلمان اہلِ مغرب کو کبھی بھی اپنا دوست نہیں سمجھ سکتے۔ اگر وہ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ فوجی، یا معاشی امداد دیکر وہ مسلم قوم کے دل مسخر کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے تو یہ محض اُن کی خام خیالی ہے۔ مسلمانوں کو سب سے زیادہ وابستگی اپنے دین سے ہے اور جو فرد یا قوم بھی اُن کے دینی احساس کو مجروح کرنے کی کوشش کرے گی وہ کبھی انھیں اپنا حلیف نہیں بنا سکتی۔"

یہ کتاب اُس انگریزی دان طبقہ کے لیے نہایت مفید ہے جو بیک نظر جماعت اسلامی پاکستان سے متعارف ہونا چاہتا ہے۔ کتاب کی طباعت عمدہ ہے اور ضخامت کے لحاظ سے قیمت کم۔ (ص،)

(بقیہ شاہراہِ مکہ)

کہ تاریخ کے ایک دور میں اسلامی تعلیمات کو عملی زندگی میں نافذ کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی جا چکی ہے۔ اور جو چیز ماضی میں ممکن تھی وہ آج کیونکر ناممکن ہو سکتی ہے؟ آخر کیا ہوا اگر مسلمانوں نے اسلام کی اصل تعلیم کو ترک کر کے جہالت کی زندگی بسر کرنا شروع کر دی ہے۔ اس میں آخر حیران کن کونسی چیز ہے کہ یہ قوم اس معیار پر زندہ نہیں رہی جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے تیرہ سو سال پہلے پیش کیا تھا — یہ معیار آج بھی دنیا کے ہر انسان کو اپنانے کی دعوت دیتا ہے۔ اور اس معیار کو قبول کرنے میں کوئی چیز بھی مانع نہیں ہے۔"

"مجھے اس امر کا پورا یقین ہے کہ آج صرف ایک فرد ہی نجات کا طالب نہیں بلکہ موجودہ سوسائٹی اس کی زیادہ ضرورت مند ہے۔ شاید آج سے پہلے کبھی بھی انسانیت نے عمرانی معاہدہ کے لیے ایک نظریاتی بنیاد کی اس قدر احتیاج محسوس نہیں کی تھی کہ وہ ہمارے اس دور میں محسوس کر رہی ہے۔ آج ہمیں ایک عقیدہ اور ایمان کی ضرورت ہے جو ہم پر مادی ترقی کا کھوکھلا پن واضح کر سکے اور اس کے ساتھ اس فانی زندگی کا جو حق ہم پر عائد ہوتا ہے، اسے بھی نظر انداز نہ کرے، جو ہماری روحانی اور مادی احتیاجات کے درمیان حسنِ اعتدال کا مظہر ہو اور اس طرح ہمیں اس تباہی سے بچائے جس کی طرف ہم تیز گیٹ دوڑے جا رہے ہیں۔"

یہ پوری کتاب اسی قسم کے صحیح احساسات و افکار سے بھری پڑی ہے۔ فاضل مصنف کی نظر گہری اور اس کا تجزیہ بہت حد تک درست ہے۔ لیکن یہ سخت ناانصافی ہو گی اگر اس سلسلے میں چند ضروری باتیں عرض نہ کر دیں۔

اس کتاب کو پڑھنے سے ایک انسان جو عام تاثر لیتا ہے وہ یہ ہے کہ فاضل مصنف اپنے جذبۂ خلوص اور جوش کے باوجود ابھی تک اپنے دل و دماغ سے مغربی اثرات کو زائل نہیں کر سکے۔ وہ جب بھی اسلامی تحریکات کا ذکر کرتے ہیں تو اُن کے بارے میں بعض اس قسم کے جملے لکھ جاتے ہیں جن سے دل کو

کافی تکلیف ہوتی ہے مثلاً یہ کہ اخوان حق پرستی کے زعم میں مبتلا تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے جہاں جہاں علما کا ذکر کیا ہے انہیں ایک تنگ نظر اور تاریک خیال گروہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ تبصرہ نگار کے نزدیک حالات کی یہ تصویر صحیح نہیں۔

دوسری چیز جو ذہن کو کھٹکتی ہے وہ یہ کہ عورت کے معاملہ میں اسلام کا جو نقطۂ نظر ہے وہ اس کی صحیح طور پر ترجمانی نہیں کر سکے۔ اسلام نے بیشک عورت کو بہت زیادہ حقوق دیئے ہیں لیکن اس نے ان پر وہ ذمہ داریاں نہیں ڈالیں جو مرد پر عائد کی گئی ہیں۔ ہم یہ بات قدرے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ عورت کے بارے میں فاضل مصنف پر "جدت" غالب ہے۔ پھر جس اہتمام کے ساتھ انھوں نے اپنی بیگمات کی تصاویر سے کتاب کو مزین کیا ہے وہ تو ان جیسے مسلمان کے وقار کے بالکل منافی ہے۔ ہم ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ان تصاویر نے آخر کتاب کی افادیت میں کس حد تک اضافہ کیا ہے۔

تیسرے اسد صاحب کے تعلقات زیادہ تر بادشاہوں اور اُمرا سے رہے اور اس وجہ سے انھوں نے اپنی سیر و سیاحت کا بیشتر حصہ محلات میں گزارا۔ اُن کی دلچسپیاں اسلام سے زیادہ مسلم سوسائٹی کے اونچے طبقہ سے رہیں۔ اسی بنا پر وہ مسلم قوم کے عوامی مسائل اچھی طرح سمجھنے سے قاصر رہے۔

تبصرہ نگار کو یہ دیکھ کر بھی حیرت ہوئی کہ وہ کتاب جو مغرب میں ایک نہایت ہی اونچے معیار پر ایک باذوق انسان کی زیر نگرانی شائع ہوئی ہے اُس میں کتابت تک کی غلطیاں موجود ہیں۔ صفحہ ۲۵۶ پر DROMEDARIES کو DOMEDERIES لکھ دیا گیا ہے۔ اسی طرح دوسری جگہوں پر چند حروف لوٹ اور حاف درج ہونے سے رہ گئے ہیں۔ اگرچہ ان کی تعداد بہت کم ہے لیکن یہ ہیں ضرور۔ ان سب خامیوں کے باوجود کتاب نہایت اچھی اور مفید ہے۔ خصوصاً جدید تعلیم یافتہ طبقے کے لیے اس میں دلچسپی کے علاوہ غور و فکر کے لیے بھی اچھا خاصا مواد موجود ہے۔

(بقیہ اشارات)

والساعة كهاتين ويقرن بين اصبعيه السبابة والوسطى ويقول، اما بعد فان خير الحديث كتاب الله وخير الهدى هدى محمد صلى الله عليه وسلم وشر الامور محدثاتها وكل بدعة ضلالة (مسلم)

کہ میری بعثت اور قیامت اس طرح ایک دوسرے قریب ہیں جس طرح کہ انگشتِ شہادت اور بیچ کی انگلی اور فرماتے بہترین کلام اللہ کی کتاب ہے اور بہترین طریقہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے اور بدترین کام نئی باتیں ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

جناب رسالت مآب نے نہ صرف اپنی پیروی کو معیارِ ایمان قرار دیا بلکہ اس بات کی بھی سختی سے تاکید فرمائی کہ جن پاکباز لوگوں کو حضور کی قربت نصیب ہوئی اُن کا اتباع بھی کیا جائے کیونکہ حضور سرورِ کائنات کی تعلیم کے چلتے پھرتے مظہر یہی خوش نصیب انسان تھے۔

عن ابی نجیح العرباض بن ساریة رضی الله عنه قال وعظنا رسول الله صلى الله عليه وسلم موعظة بليغة وجلت منها القلوب وذرفت منها العيون. فقلنا يا رسول الله كانها موعظة مودع فاوصنا قال اوصيكم بتقوى الله والسمع والطاعة، وان تأمر عليكم عبد حبشي، وانه من يعش منكم فسيرى اختلافاً كثيراً فعليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين عضوا عليها بالنواجذ واياكم ومحدثات الامور فان كل بدعة ضلالة (ابوداؤد)

حضرت عرباض بن ساریہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ایسی بلیغ اور مؤثر نصیحت فرمائی جس سے ہمارے دل دہل گئے اور آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ نصیحت تو ایسی ہے جیسے کہ آپ ہم سے رخصت ہو رہے ہوں۔ آپ ہمیں وصیت فرمائیں۔ آپ نے کہا، میں تمھیں پرہیزگاری سمع و اطاعت کی وصیت کرتا ہوں اگرچہ تم پر ایک حبشی غلام حاکم ہو اور تم میں سے جس کی عمر لمبی ہوگی وہ بہت اختلاف دیکھے گا تو چاہیئے کہ تم لوگ میری اور میرے راست رو، ہدایت یافتہ جانشینوں کی سنت کا اتباع لازم کر لو اور اس کو دانتوں سے پکڑ لو اور خبردار نئی نئی باتوں سے بچتے رہنا، کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے۔

اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم | میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں۔ تم ان میں سے جس کی اقتدا کروگے ہدایت پاؤگے۔

حدیث کے علاوہ آثارِ صحابہ سے یہ چیز ثابت ہے کہ حضور کی صحبت سے فیض یاب ہونے والوں کے نقشِ قدم پر چلنے ہی میں عافیت ہے۔ چنانچہ حدیث کی مشہور کتاب الدارمی کے مقدمے سے صرف دو اقوال نقل کیے جاتے ہیں۔

الشعبی: ایاکم والمقاسیة والذی نفسی بیدہ لئن اخذتم بالقاسیة لتحلن الحرام ولتحرمن الحلال ولکن ما بلغکم عمن حفظ من اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم فاعملوا بہ (الدارمی ص۲ء) | قیاس آرائیوں سے بچو، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر تم قیاسات پر چلے تو حرام کو حلال اور حلال کو حرام کردو گے لیکن تمہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سے جو طریقہ محفوظ پہنچا ہے، تم اس پر عمل کرو۔

"علم کو حاصل کرو، قبل اس کے کہ یہ سمیٹ لیا جائے اور اس کا سمیٹنا یہ ہے کہ اہلِ علم اٹھا لیے جائیں۔ علم کو حاصل کرو، کوئی نہیں جانتا کہ کب اس کی ضرورت پڑے یا یہ جس کے پاس ہے اس کی حاجت آن پڑے۔ تم عنقریب ایسے لوگ پاؤگے جن کے بارے میں تمہیں گمان ہوگا کہ وہ تمہیں قرآن کی طرف بلا رہے ہیں حالانکہ قرآن کو انھوں نے پس پشت ڈال رکھا ہوگا علم حاصل کرو اور بدعت سے بچو، چرب زبانی سے بچو۔ اور قدیم پر قائم رہو۔ (الدارمی ص۳۰)

سلف صالحین کی پیروی پر اس قدر تاکید کو پڑھ کر ممکن ہے کہ کسی شخص کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اگر ہم ہمیشہ گزرے ہوئے انسانوں کی تقلید کرتے رہے تو اس سے ہماری ترقی رک جائے گی لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اصل صورتِ حال یہ نہیں ہے جس کا کہ خطرہ پیش کیا جا رہا ہے۔ جب ہم ماضی میں ایک روشن نصب العین اور اس کی عملی تعبیر سے روشناس ہو جاتے ہیں تو ہم ہاتھ پاؤں توڑ کر نہیں بیٹھ جاتے بلکہ ہم ہر آن اس بات کے لیے کوشاں رہتے ہیں کہ ہم اب اس نصب العین کو زمان و مکان

کی حد بندیوں میں مقید کریں، پھر ہمارے سامنے چونکہ اس نصب العین کی ایک عملی تصویر بھی موجود ہے، اس لیے ہم اپنی سعی و جہد کی نہ صرف قدر و قیمت کا تعین کر سکتے ہیں بلکہ اُس کی سمت کا بھی بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تعبیر کی یکسانیت ہمارے لیے نئے نئے حقائق کی تخلیق کرتی ہے۔ اور اس طرح ہمارے اندر یہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ ہم اپنے عمل کے نتائج پر غور و فکر کر سکیں۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں اُس کے وزن کرنے کے لیے کچھ خارجی پیمانے بھی تو درکار ہیں۔ اور وہ ہمارے نزدیک رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور امت کے دوسرے صلحاء کی مقدس زندگیاں ہیں۔ ان نفوسِ قدسیہ نے جو کچھ سمجھا یا کیا اُسے ہم کسی وقت بھی نظر انداز نہیں کر سکتے اور اگر ہم اُن کو اپنی آنکھوں سے اوجھل کر کے جدت پیدا کریں گے تو یقیناً صحیح راہ سے ہٹ جائیں گے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلۂ نبوت ختم ہونے کے بعد اب خوب و ناخوب کے کوئی نئے پیمانے اور معیار وضع نہیں کیے جا سکتے بلکہ اب ہماری ساری تخلیقی قوتیں اسی بات کے لیے وقف ہیں کہ اُن کے مطابق زندگی کی تعمیر کریں اور ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھتے رہیں کہ کیا ہمارا نقشہ حیات اُس معیاری نقشہ سے کسی جگہ مختلف تو نہیں ہو گیا۔ شعور، عقل و وجدان کے امتزاجی فعل سے بلاشبہ زندگی کو وسیع سے وسیع تر کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے لیے نہ صرف منزل کا تعین ضروری ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ راستے کے سنگِ میل واضح اور چراغ روشن ہوں۔ جو ملت یا قوم ان چیزوں سے صرفِ نظر کر لیتی ہے وہ منزل کی طرف بڑھنے کی بجائے بے مقصدی کی بھول بھلیاں میں بھٹک کر رہ جاتی ہے۔

ان گزارشات کے بعد یہ حقیقت کسی حد تک واضح ہو چکی ہے کہ ایک مسلمان کے اپنے ماضی سے رشتے کی نوعیت دوسری اقوام سے کیونکر مختلف ہے۔ ایک قوم جس کا ماضی اُس کے لیے روشن ترین ہو، جس کے بارے میں اُس کے ہادیٔ برحق نے یہ کہا ہو: خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم، ثم الذین یلونھم، ثم یفشو الکذب، اُس کے متعلق اُس کے دل میں وہ معاندانہ جذبات کس طرح پرورش پا سکتے ہیں جو یورپین اقوام نے اپنے ماضی کے تاریک ادوار (DARK AGES) کے متعلق اپنے سینوں میں پال رکھے ہیں۔ وہ قومیں جن کا ماضی سخت گھناؤنا ہو، وہ اگر اس سے نفرت کریں، تو اس میں معقولیت بھی ہے لیکن وہ ملت جس کا ماضی اُس کے لیے سنہری زمانے کی حیثیت رکھتا ہو، جو درخشندہ اور تابناک ہو، جس کے نقوش آج بھی اُس کے حافظے میں محفوظ ہوں، اور جو ہر دور میں اس کے لیے مشعلِ راہ کا کام دے، وہ اگر اپنے آپ کو ماضی سے منقطع کرنے کی حماقت کرے تو اس سے زیادہ بیوقوف دنیا میں اور کون ہو سکتا ہے؟

صفحه خالی

مجموعہ تفاسیر فراہی

تالیف : مولانا حمید الدین فراہی رحمۃاللہ علیہ
ترجمہ : مولانا امین احسن اصلاحی

مولانا حمید الدین فراہی اس دور آخر میں تفسیر کے امام گذرے ہیں ۔ انہوں نے قرآن پر فکر و تدبر کی نئی راہیں کھولیں اور اس کی وہ مشکلیں حل کیں جو اب تک تفسیر کی کتابوں میں حل نہیں ہوسکی تھیں ۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی اصل تفسیر عربی میں ہے ۔ اس کے جو اجزاء شائع ہو چکے تھے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد خاص

مولانا امین احسن اصلاحی

نے ان کا شستہ اور شگفتہ اردو میں ترجمہ کر دیا ہے اور شروع میں مصنف کے مختر حالات زندگی بھی دے دیئے ہیں اور مولانا حمید الدین فراہی کے مقدمہ تفسیر کا ترجمہ بھی شامل کر دیا ہے جو اصول تفسیر پر مولانا کے قلم سے ایک نہایت جامع رسالہ ہے ۔ اس مجموعہ میں مقدمہ تفسیر کے علاوہ ذیل سورتوں کی تفسیروں کے ترجمے شامل ہیں :—

تفسیر آیۃ بسم اللہ ، تفسیر سورۂ فاتحہ ، سورۂ ذاریات ، سورۂ قیامہ ، سورۂ تحریم سورۂ عبس ، سورۂ والشمس ، سورۂ والتین ، سورۂ والعصر ، سورۂ فیل ، سورۂ کوثر ، سورۂ کافرون ، سورۂ لہب ، سورۂ اخلاص ۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ان میں سے ہر تفسیر میں قرآن مجید کی ایسی اہم مشکلیں حل کی ہیں جو قرآن کے دوسرے مشکل مقامات کے حل کے لئے کلید کا کام دیتی ہیں اور یہ بات پورے اطمینان سے کہی جاسکتی ہے کہ اگر ایک شخص مولانا کے مقدمہ تفسیر قرآن کی روشنی میں ان تمام اجزاء کا بغور مطالعہ کرے تو وہ مولانا فراہی کے اسلوب فکر سے اچھی طرح آشنا ہو جائیگا اور قرآن پر محققانہ تدبر کے لئے اپنی راہیں خود کھول لیگا ۔

تفسیری حقائق و معارف کا یہ مجموعہ ۴۵۲ صفحات ۲۰×۳۰/۸ سائز پر مشتمل ہے اور اس کے متعلق بلا تکلف یہ دعوی کیا جا سکتا ہے اسکا ہر صفحہ تفسیری حقائق کا بیش بہا گنجینہ ہے ۔ کتابت و طباعت نہایت نفیس ۔ جلد عمدہ کپڑے کی قیمت — چودہ روپے

تعلیمات

تعلیم کے موضوع پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اب تک جو کچھ فرمایا یا لکھا ہے نیز جماعت اسلامی نے تعلیم کے موجودہ تصور اور رائج الوقت طریق تعلم اور نصاب میں جس انقلابی تبدیلی کی اسکیم پیش کی ہے اس سارے مواد کو اس مجموعے میں یکجا کر دیا گیا ہے ۔ دیدہ زیب گرد پوش کے ۲۰+۳۰ سائز سفید کاغذ ۲۸۸ صفحات قیمت صرف تین روپے ۔ فوراً اپنی فرمائش سے مطلع فرمائیں ۔ ۱۶